آبِ رواں

(نثر پارے)

محسن خالد محسنؔ

DUA PUBLICATIONS

ناشر: زاہد شیخ

"اے رب! میرے علم میں اضافہ فرما"

ہماری کتابیں، معیاری کتابیں، پیاری کتابیں

نام کتاب	ـــ	آبِ رواں
مصنف	ـــ	محسن خالد محسن
اشاعت	ـــ	2016ء
کمپوزنگ	ـــ	انتش مبین
ڈیزائن	ـــ	محمد احسن گل
مارکیٹنگ	ـــ	عقیل باقر
مطبع	ـــ	وقاص جاوید پرنٹرز، لاہور
قیمت	ـــ	-/300 روپے

دُعا پبلی کیشنز

الحمد مارکیٹ اُردو بازار لاہور۔ فون: 042-37233585
E-mail: duapublications@yahoo.com

خوبصورت اور معیاری کتب چھپوانے کیلئے رابطہ کریں ـــ زاہد شیخ : 0300-9476417

انتساب

☆ ایک شخص کے نام جسے میری زندگی اور میری ہر سانس پر کُلی اختیار حاصل ہے۔

☆ ایک شخص کے نام جو خیال کے فاصلے پر خود کو میری امانت سمجھ کر میرا ہو کر میرے لیے جی رہا ہے۔

☆ ایک شخص کے نام جسے یقین ہے کہ میری زبانِ قلم سے ادا ہوا ہر لفظ اس کے جذبات کا غماز ہے۔

یہ شخص قدرت کی قابلِ متفخر تخلیق ہے جسے رب تعالیٰ نے صرف میرے لیے بنایا ہے جو میرے بہت قریب لمحوں کے فاصلے پہ ایستادہ میری آغوشِ زیست کا منتظر ہے۔

بقول شاعر

وہ مجھ سے اتنی محبت جتانے لگتا ہے
کبھی کبھی تو مجھے خوف آنے لگتا ہے

تعارفِ مصنف

نام : محمد محسن خالد

قلمی نام : محسن خالد محسنؔ

بنیادی تعلق : رسول پور چک ۵ کرانی والا (پتوکی)

حال مقیم : لاہور

تعلیم : فاضل اُردو، ایم اے اُردو، ایم اوایل، ایم فل (اُردو)
بی ایڈ، پی جی ڈی (کمپیوٹر)

ذریعہ معاش : ماہر مضمون اُردو
(ڈویژنل پبلک سکول وانٹرمیڈیٹ کالج، ماڈل ٹاؤن لاہور)

علمی وادبی کام : کچھ کہنا ہے۔ آبِ رواں۔ کچھ لفظ کچھ معنی۔ محبت دُکھ دیتی ہے۔
منتخب دیوانِ بیت بازی۔ اُردو گرائمر (جماعت اوّل تا پنجم)۔
اُردو گائیڈ (جماعت نہم۔ دہم) ودیگر

برقی رابطہ : mohsinkhalid53@gmail.com
Facebook:mhsinkhalidmohsin

رابطہ : 0301-4463640

آبِ رواں سے منتخب کچھ نثر پارے

☆ حقیقت تک پہنچنے کے لیے ضروری ہے کہ حقائق کو شک کی نگاہ سے دیکھا جائے۔

☆ سب سے بڑی دولت اپنی ذات پر مطمئن ہونا ہے۔

☆ یک طرفہ محبت اکثر ناکام اس لیے ہوتی ہے کیونکہ دو یکطرفہ باہم ہونے کی کوشش نہیں کرتے۔

☆ خوبصورت الفاظ کی ادائیگی مہذب زبان سے ممکن ہے۔ چرب زبان الفاظ کو چارہ سمجھ کر نگلتی اُگلتی رہتی ہے۔

☆ بچپن ایک کٹی ہوئی پتنگ کی طرح ہوتا ہے جس کی مکرر خواہش زندگی کی شمع گل ہونے تک برقرار رہتی ہے۔

☆ دُنیا میں سب سے مشکل کام اپنی ذات کو تمام ترعیبوں کے ساتھ قبول کرنا ہے۔

☆ خوش قسمتی کا انحصار مال ودولت یا شہرت وعزت پر نہیں ہوتا۔ اپنی ذات کی اچھی بری جبلّت کو فطرتاً قبول کرنے سے ہوتا ہے۔

☆ کسی شخص کو سچا اور جھوٹا ثابت کرنا دُنیا کا مشکل ترین کام ہے لیکن ہم یہ کام لمحوں میں کر گزرتے ہیں۔

☆ دُنیا میں ایک ہی شخص ہے جو آپ کو اور آپ کی زندگی کو بدل سکتا ہے، وہ شخص آپ خود ہیں۔

☆ کچھ رشتے دو ہونٹوں کے درمیان محفوظ ہونے کے باوجود غیر محفوظ رہتے ہیں۔

☆ کسی شخص کی کامیابی اور خوشحالی کا انحصار باشعور اور تعلیم یافتہ ماں پر منحصر ہے۔

☆ اپنے آپ کو جھوٹا تسلیم کرنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا کسی دوسرے کو سچا ماننا۔

☆ تارکِ دُنیا ہونے سے زندگی اپنا رُخ نہیں بدلتی بلکہ یہ بے مہار گھوڑے کی طرح محوِ سفر رہتی ہے۔

☆ محبت کرنا کوئی جرم نہیں لیکن محبت کے نام پر کسی شخص کو گھر کی چار دیواری میں مقید کر دینا کسی ظلم سے کم بھی نہیں۔

☆ رشتہ اسی وقت ختم ہو جاتا ہے جب ذہنی طور پر اس سے فرار کی خواہش بیدار ہو جائے۔

☆ صداقت کا گلہ گھونٹ دینے سے جھوٹ کی فتح نہیں ہوتی۔

☆ انسان کی تکمیل عشق کی تذلیل پر دلالت کرتی ہے اور عشق کی تکمیل انسان کی تحقیر پر منحصر ہے۔

حرفِ آغاز

دُنیا میں جب پہلی بار بچہ آنکھ کھولتا ہے تو اپنے اردگرد ہنستے، مسکراتے لوگوں کی طرف حیرانی سے دیکھتا ہے اور پھر آنکھیں میچ کر کنکھیوں سے دیکھتا ہے کہ میری پیدائش پر یہ لوگ ہنس کیوں رہے ہیں؟ کیا میرے بلا معاوضہ دُنیا میں آ جانے پر حیران ہیں یا کسی ہنگامی ضرورت کے تحت پیدا کیا گیا ہوں۔ مرورِ وقت کے ساتھ بچہ بڑا ہو جاتا ہے۔ پھر یہی لوگ اجنبی لوگ ماں، باپ، بہن، بھائی، چچا، تایا، ماموں، نانا، دادا وغیرہ کے رشتوں میں بٹ کر اس سے مخاطب ہوتے رہتے اور اپنے رشتے کا نام لے لے کر اسے احساس دلاتے ہیں۔ عمر بڑھتی جاتی ہے اور یہ رشتے محبت کی بجائے زہر اُگلنا شروع کر دیتے ہیں۔ بچپن میں گود میں اُٹھانے والے پاؤں تلے رُوندنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اپنے منہ سے نوالا نکال کر کھلانے والے اس کے حصے کا رزق چھیننے کی کوشش میں منافقانہ رویہ اپناتے ہیں بلکہ ساتھ پیدا ہونے والے ساتھ چھوڑ جاتے ہیں حتیٰ کہ پیدا کرنے والے پیدا کرنے پر پچھتاوے کا ماتم کرتے ہیں۔

زندگی کہنے کو پُرکشش اور جاذبِ نظر ہے مگر رشتوں میں منافقت اور مفاد کی بُو ان خونی اور خود ساختہ رشتوں کی چمک کو ماند کر دیتی ہے اور یوں ایک کامیاب شخص ایسے تناور درخت کی طرح ڈھ جاتا ہے جس کے پتوں اور شاخوں کو کسی نے شب خون مار کر کاٹ ڈالا ہو اور وہ صبح کی روشنی میں خود کو برہنہ پا کر اپنے ہی وجود سے شرمسار ہو رہا ہو۔

سوال یہ ہے کہ زندگی اگر ایک پھول کا نام ہے تو پھر کانٹوں میں چُبھن کیوں ہے؟ یہ زخم کرتے وقت دیکھتے کیوں نہیں کہ جسے زخم دیا جا رہا ہے وہ اس کو برداشت کرنے کی ہمت بھی رکھتا ہے کہ نہیں؟ زندگی اگر ایک معصوم دوشیزہ کا خواب ہے تو اس کی تعبیر بتانے اور قبول کرنے سے لوگ خوف زدہ کیوں ہوتے ہیں؟ زندگی اگر ایک ماتا کی محبت ہے تو یہی ماتا اپنے کلیجے کے ٹکرے کو ہوا کے دوش پہ کیوں اُچھال دیتی ہے، جسے بے رحم آفتاب کی تپش جھلسا کر کباب بنا دیتی ہے؟ زندگی اگر باپ کی خوبصوت جاگیر ہے تو باپ اس کی حفاظت کی بجائے اسے گروی رکھ کر اپنے مطالب و مفادات پورے کرتا کیوں نظر آتا ہے؟ زندگی اگر بہن بھائیوں کے پاؤں کی پازیب ہے تو اسے بیچ کر اپنے لیے ہار سنگھار کی ضرورت کیوں لاحق ہوتی ہے؟ زندگی عورت کی بے لوث محبت کا نام ہے تو اس عورت نما محبت کو گلیوں میں رُسوا کر کے محظوظ کیوں ہوا جاتا ہے؟

زندگی کیا ہے اور کیوں ہے؟ اس کی تفہیم سمجھ سے بالاتر نہیں ہے۔ المیہ یہ ہے کہ ہم خود کو سمجھنا ہی نہیں چاہتے بلکہ ہمیشہ گلہ کرتے ہیں کہ ہمیں کوئی سمجھنا نہیں چاہتا، ہمیں کوئی سمجھتا ہی نہیں۔ والدین کو اُولاد سے گلہ ہے کہ ہماری اُولاد ہمیں سمجھ نہیں رہی اور اُولاد اپنی جگہ پریشان ہے کہ والدین ہمیں جینے نہیں دیتے۔ ہم خود اپنے فیصلے کرنا چاہتے ہیں۔ اب کون کس کی زندگی کے فیصلے کرنا چاہتا ہے اور وہ فیصلے کس کی زندگی سے کیے جا رہے ہیں ، عجیب گورکھ دھندہ ہے۔ ہم نے خود زندگی کو اس قدر اُلجھا دیا ہے کہ ہم زندگی کو زندگی ہی نہیں سمجھتے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم خود کو نہیں سمجھ سکتے اور نہ سمجھنا چاہتے ہیں۔ ہر کوئی یہی کہتا پھرتا ہے مجھے میرے فیصلوں پہ اختیار ہونا چاہیے۔ میں اپنے زندگی کا فیصلہ خود کروں گا اب میں بڑا ہو گیا ہوں۔

زندگی مختصر ہے، ہم سب سمجھتے ہیں اور یقین بھی رکھتے ہیں لیکن ہم یہ سمجھنے سے قاصر

ہیں کہ زندگی آخر کس گورکھ دھندے کا نام ہے؟ آخر اس کی تفہیم و تقسیم ہمارے خیالات اور خواہشات کے مطابق کیوں نہیں ہوتی؟ جہاں جذبات کو ٹھیس پہنچتی ہے وہاں دُکھ ہوتا ہے اور یہ دُکھ کسی نہ کسی ذات کے ساتھ جُڑے رشتے سے درپیش ہے۔ ہم کسی کو دُکھ میں مبتلا کر کے معذرت کر لیتے ہیں اگر ہمیں کوئی دُکھ دے جائے تو گلے شکوے، لعنت و ملامت کے طوفان برپا کر دیتے ہیں۔ ہم رشتوں کے معاملے میں وحدانیت کے قائل نہیں بلکہ ایک رشتے کے ساتھ ایک ثانوی رشتہ ہمیشہ بنا کر رکھتے ہیں جسے ہنگامی حالات کے پیش نظر استعمال کر سکیں۔ عجیب ہے نا! ایک رشتے کو پوری طرح نبھاتے نہیں اور دوسرے رشتے کو قبول کرنے کے لیے ہمیشہ تیار اور اس کی تائید کے منتظر رہتے ہیں

ہم آخر کیوں نہیں سمجھتے کہ رشتوں کی مضبوطی اعتماد اور خلوصِ نیت سے چاہنے اور عزت دینے سے ہوتی ہے۔ پہلی نظر میں پری پیکر وجود کو شیریں سمجھ کر منہ میں ڈال لیتے ہیں اور پھر معمولی سی رنجش کا بہانہ بنا کر اُگل دیتے ہیں۔ زندگی انسان کے معاملات میں از خود دخل انداز نہیں ہوتی بلکہ زندگی اپنا سفر طے کرتی رہتی ہے لیکن ہم اپنے متعین کردہ رستوں سے ہٹ کر **سائیڈ ٹریک** پر چلنا شروع کر دیتے ہیں کیونکہ ہم سمجھتے ہیں کہ متعین کردہ راستے معاشرتی رسموں، رواجوں اور قدامت پسندی کی زنجیروں میں جکڑے ہوتے ہیں اور ثانوی خود ساختہ راستے ہماری کامیابی اور انفرادیت کے معیار کا غماز ہوتے ہیں۔

آپ سمجھ رہے ہوں گے کہ میں خود کو فلاسفر ثابت کرنے کی بھرپور کوشش کر رہا ہوں اور صرف میں ہی جانتا ہوں کہ زندگی کا اصل چہرہ اور اس کی ساخت و پرداخت کیا ہے؟ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ میں ایک معمولی اور نکما سا انسان ہوں جسے ایک سچا اور کھرا انسان بننا گوارہ نہیں اور شاید تابع فرمان اُولاد کا اعزاز بھی اس کی آوارگی میں دخیل ہونے کی سازش کرتا رہتا ہے۔

کچھ کہنا ہے میرا پہلا مجموعہ کلام تھا۔ آپ نے پڑھا ہوگا یا سنا ہوگا پسند آیا یا نہیں اس بات سے کیا فرق پڑتا ہے۔ آپ کی پسند اور دل چسپی کو میں اپنے ذوق کے لیے پابند نہیں کر سکتا۔

آبِ رواں آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اگر اس کتاب کا کوئی خیال یا نثر پارہ آپ کے دل کی پنکھڑیوں کو متبسم کرنے میں کامیاب ہو جائے تو میں سمجھوں گا کہ آپ بھی میرے ہم سفر ہیں اور میری طرح حالات اور معاشرے کے بل کھاتے ہوئے اطوار کی پیہم گردش کا تجربہ رکھتے ہیں۔

زندگی ایک دائرہ ہے اس دائرے میں ہم ایک مزید دائرہ بنا کر اپنی ذات میں محو گردش ہیں۔ محبت اس مدار کے چمن میں کبھی بارش تو کبھی طوفان کے پیرہن پہن کر جلوہ گر ہوتی ہے۔ اب آپ پر منحصر ہے کہ آپ زندگی کے دائرے میں پناہ لیتے ہیں یا خود کو اپنی ذات کے قالب سے اُوجھل کر کے زندگی کے دائرے میں پنہاں ہو جاتے ہیں۔

کتاب پڑھنے کے بعد ان تاثرات کا اظہار ضرور کیجیے گا۔

آپ کی آرا کا منتظر

محسن خالد محسنؔ

”آبِ رواں“ میری نظر میں

لاشعور میں بسے زیست کے گورکھ دھندے کو الفاظ میں ملبوس کر کے سرِعام محورِقص چھوڑ دینا ایک ستائش آمیز مگر دقیق فعل ہے، کیونکہ اکثر اُوقات ہماری تنگ نظری کا ضعیف ظرف ہمارے لاشعور کو شرم و حیا میں قفس نشین رکھتا ہے اور شدید خواہش رکھنے کے باوجود بھی ہم محورِقص نہیں ہوتے۔۔۔۔ پھر بھی ہم اپنی اس خواہش کی تکمیل کے لیے ایک اور سبیل ڈھونڈ لیتے ہیں وہ یہ کہ ہم دوسروں کے خیالات سے اپنے لاشعور میں بسنے والے زیست کے گورکھ دھندے کی پیائش کرنے لگتے ہیں، لیکن خود اپنے ذہن کے ترازو میں خیالات کا بوجھ ڈال کر تو لتے نہیں۔

اکثر ہماری زیست کے گوہر کسی بے وجود خوف کے تابع ہی رہ جاتے ہیں، مگر ہر شخص اس بے وجود خوف کے زیرِ سایہ پروان نہیں چڑھتا۔ کچھ لوگوں نے اپنی ذات سے ہٹ کر تخیل میں ایک دل فریب جہاں بسا ہوتا ہے جس میں وہ اپنے خیالات کو رقص بھی کرواتے ہیں اور ان کو بیان کرنے کے لیے ترازو بھی وہ اپنا استعمال کرتے ہیں، مستعار نہیں لیتے۔

محسن خالد محسنؔ بھی انھیں لوگوں میں سرِفہرست ہیں جنھوں نے اپنی کل کائنات کو شاعری کی شاہانہ پوشاک پہنا کر ہمارے سامنے محورِقص چھوڑ دیا

ہے۔جس نے ایک ادنیٰ مخلوق شرم وحیا کے قفس سے رہائی بھی پائی ہے۔

آبِ رواں کے بارے میں یہی کہوں گی کہ محسن خالد محسنؔ نے دل کی اتھاہ گہرائیوں میں اُتر جانے والی کیفیت کی تے میں ڈوبے فکر کے حامل خیالات کو نثر پاروں کی صنف میں تخلیق کیا ہے۔جن کی تاثیر قاری کے ذہن پر نقش ہو جاتی ہے۔ان کی شاعری اور نثر نگاری کا منفرد مگر دلکش انداز رنگ جمالِ یار لیے میرے آنچل میں بھی موجود ہے مگر میں ابھی تک قفس نشینی میں ہوں اور محسن خالد محسنؔ جیسے آزاد شاعر کے ترازو سے اپنے خیالات کا بوجھ ماپ رہی ہوں۔یوں لگتا ہے جیسے کسی نے میرے لاشعور کا تجزیہ کر کے اس پر کتاب تحریر کردی ہو۔

مہ جبیں بشیر

لیکچرار آئی بی ایل کالج آف کامرس لاہور

محسن خالد محسنؔ سے میری شناسائی غزالی پریمئر کالج میں ہوئی۔ مجھے محسوس ہوا کہ میں ایک فلاسفر سے راست گو نوجوان سے مل رہا ہوں، جو ہر حوالے سے ایک سچا اور کھرا انسان ہے۔یہ نوجوان اپنے تخیلات کو الفاظ کے خوبصورت قالب میں ڈھالنے کا فن خوب جانتا ہے۔اس کے خیالات انسان کے قلبِ مضطرب کو سکون اور طمانیت کی لذت سے محظوظ کرنے کا سلیقہ عطا کرتے ہیں۔

بلاشبہ میدانِ سخن میں اس کی آمد نئی ہے مگر اس کے اُسلوب اپنے اسلاف کے فن سے اثر کھاتا ہے۔محسن خالد محسنؔ نے شاعری میں بھی طبع آزمائی کی اور کچھ کہنا ہے کہ نام سے پہلی کتاب کی زبردست پذیرائی ہوئی جو ادب کے حلقوں میں انھیں بطور شاعر متعارف کروانے ایک معتبر حوالہ بنی۔

محسن خالد محسنؔ نے نوجوان نسل کو شعور اور فہم شناسی کی تحریک دینے کی بھرپور کوشش آبِ رواں میں کی ہے۔ اس کتاب کے علاوہ انھوں نے کچھ کہنا ہے، کچھ لفظ کچھ معنی، محبت دُکھ دیتی ہے، کے نام سے کتابیں لکھ کر اپنے مخصوص لب ولہجہ کی انفرادیت کا ثبوت پیش کیا ہے جسے قارئین وناقدین نے سراہا ہے اور اُردو ادب میں ایک اضافہ قرار دیا ہے۔

بلاشبہ یہ کتاب لکھنے پر محسن خالد محسنؔ مبارکباد کے مستحق ہیں، جس میں لفظوں کی گہرائی میں چُھپی معاشرے کی اصلیت اور افکار کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

میری دُعا ہے کہ ربِ تعالیٰ محسن خالد محسنؔ کے زورِ قلم میں روانی عطا کر کے میدانِ سخن کے اُوجِ کمال سے آشنا کردے اور اُن کامیابیوں سے ہمکنار کرے جس کا محسنؔ متمنی ہے۔

عامر فراز بلوچ

صدر شعبہ انگریزی، پریمئر کالج لاہور

اے مرے ہم سفر تو سلامت رہے
مجھ کو حاصل یہ تیری رفاقت رہے

تو مجھے عمر بھر یونہی چاہے سدا
اور قائم ہمیشہ یہ محبت رہے

یا الٰہی میں چشمِ کرم کا ہوں طالب
مجھ گنہ گار پر تیری رحمت رہے

بھیجتا ہی رہوں اُنؐ پہ محسنؔ دُرود
جاگتی ہر گھڑی میری قسمت رہے

....

ہم ہمیشہ انا کے سائے میں خود کو پروان چڑھتا دیکھتے ہیں اور بھول جاتے ہیں کہ ہم انسان ہیں۔حالاں کہ انسانیت کا بشری تقاضا محض یہی ہے کہ رشتوں کی گرہ کو ایک مضبوط بندھن کی طرح نبھایا جائے لیکن ہم اپنی خود ساختہ انا کی پرورش و پرداخت نسلی، خونی اور جذباتی رشتوں کی بھینٹ چڑھا کر کرتے ہیں۔ایک وقت آتا ہے جب سب رشتے ایک ایک کر کے ہمارے قُرب سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ تب ہمیں احساس ہوتا ہے کہ ہم نے خود کو ایک دُھوکے میں رکھا جو محض ایک طلسماتی خواب کے سوا کچھ نہ تھا۔

ماں اللہ کا ایک خوبصورت تحفہ ہے جو اللہ ہماری پیدائش پر ہمیں ودیعت کرتا ہے کچھ لوگ ان کی قدر اس کی اہمیت کے پیشِ نظر کرتے ہیں اور کچھ اسے مقدس تابوت سمجھ کہ تاک پر سجائے رکھتے ہیں۔ماں، لفظ جتنا خوبصورت ہے اتنا ہی اپنائیت کے احساس سے لبریز بھی ہے۔ماں کی تخلیق میں خدا نے اپنا سارا فنِ تخلیق صرف کر دیا، جبھی تو یہ رشتہ اتنا انمول اور لازوال ہے۔

باپ کی محبت ماں کی شفقت سے مقدم ہے لیکن ماں کی محبت کے آگے باپ کی محبت ہمیشہ سرنگوں رہتی ہے۔ مجھے ہمیشہ یہی محسوس ہوا کہ ماں کی محبت باپ کی محبت پر ایک خوبصورت احساس کا پردہ ڈال دیتی ہے جسے ہٹا کر دیکھنے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔کبھی جی میں آیا یا کبھی باپ کی تنہائی کا احساس ہوا تو باپ کو ذرا یاد کر لیا اور کسی نئی مہم یا ذمہ داری کا سندیس دے کر پھر سے اس کے فروزاں چہرے پر اپنائیت کا آنچل اُوڑا دیا۔ماں کی محبت کے درمیان باپ کی محبت ایک پل کا کام دیتی ہے جس کا توازن ہماری محبت اور توجہ کے میزان میں اکثر ڈگمگا جاتا ہے۔

مجھے جینے کی عادت بزدل کرتی ہے، میں مرنا چاہتا ہوں تا کہ بہادر بن سکوں۔

نفرت ایک عادت کے سوا کچھ بھی نہیں ہوتی۔

رشتے بہت اہم ہوتے ہیں لیکن ہم انھیں عُجلت میں گنوا دیتے ہیں۔ کچھ رشتے محض ہوتے ہی اس لیے ہیں کہ انھیں نظر انداز رکھا جائے۔ کچھ رشتے خودساختہ ہونے کے باوجود خونی رشتوں پر مقدم تصور کیے جاتے ہیں۔ کچھ رشتے ہمیشہ نظروں سے اُوجھل رہتے ہیں۔ کچھ رشتے ہم یاد کی حد تک سنبھال کر رکھتے ہیں۔ کچھ رشتے ہمارے نصیب کے میزان میں ایک مقدس قرآن کی طرح مزین رہتے ہیں۔ کچھ رشتے ہمارے لیے آزمائش کا ذریعہ بنتے ہیں۔ کچھ رشتے ہمیں مجبور کر دیتے ہیں۔ کچھ رشتے ہمیں مسرت بخش احساس دلاتے ہیں۔ رشتوں کو ہم کسی میزان میں تول نہیں سکتے، ان کی کانٹ چھانٹ نہیں کر سکتے، ان کی پرورش و پرداخت نہیں کر سکتے، انھیں لاوارث نہیں چھوڑ سکتے، انھیں نظر انداز نہیں کر سکتے، ان سے بیر نہیں رکھ سکتے، ان سے خودساختہ محبت نہیں کر سکتے۔ رشتے کیا ہیں، رشتے کیسے ہوتے ہیں، رشتے کیوں بنتے ہیں، رشتے آخر کیوں ضروری ہیں تمام عمر ایسے ہی رشتوں کی ناپ تول میں گزر جاتی ہے۔ جب کوئی رشتہ ٹوٹتا ہے یا ہم سے جدا ہوتا ہے تب ہمیں اس کی اہمیت اور قدر کا احساس ہوتا ہے۔ رشتے صحرا میں اُگے خودرو پودے کی طرح ہوتے ہیں، جنھیں قدرتی عناصر کی قوتِ نمو ترو تازہ رکھتی ہے۔ رشتے گلستان میں کھلنے والے غنچے کی طرح ہوتے ہیں جنھیں آفتاب کی حدت سلگا دیتی ہے۔ رشتے بے زبان ہوتے ہیں، انھیں گویا ہونے کی عادت انسان کی زبان شناسی کی چاشنی سے ہوتی ہے۔ رشتوں کو سمجھنا مشکل ہوتا ہے۔ رشتے بہت آسان فہم ہوتے ہیں۔ رشتے ہماری ذات کا حوالہ ہوتے ہیں۔ رشتے انسانوں کی شناخت ہوتے ہیں۔ رشتوں اور انسانوں کو جدا نہیں کیا جا سکتا جیسے خدا کو اس کی مخلوق سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔

محبت محض ایک جذباتی رشتہ نہیں ہے جو محبوب مزاج شخص کے دل میں شگوفہ بن کر کھلتا ہے۔ محبت ایک امتحان نہیں ہے جس میں سرخرو ہونے کی ہر شخص کو ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ محبت عبادت نہیں ہے جس میں ریا کا خدشہ ہو۔ محبت لاحاصل نہیں ہے جس میں رائیگانی کا احساس ہو۔ محبت وصال نہیں ہے جس میں جمود کا عنصر متشکل ہو۔ محبت فراق نہیں ہے جس کی فرقت میں احساس کے جھرنے تک سوکھ جائیں۔ محبت خدا نہیں ہے جس کی بے نیازی اسے برباد کر دے۔ محبت حاصل نہیں ہے جس کا حصول زندگی کی جہتوں سے ماورا ہو۔ محبت کیا ہے؟ محبت کچھ بھی نہیں ہے۔ محبت سب کچھ ہے۔ محبت کی تفہیم محبت کی شناخت کا معتبر حوالہ ہے۔ محبت ایک خیرات ہے جسے جتنا بانٹا جائے، کم نہیں ہوگی۔ محبت دریا ہے جس کی روانی میں اشکوں کی ندامت کا راز پنہاں ہے۔ محبت ایک تحفہ ہے جسے سنبھال کر رکھنے کی تمنا بے قرار رہتی ہے۔ محبت مخلوق ہے جسے اپنے خالق کی تلاش رہتی ہے۔ محبت مجاہدہ ہے جس کی رسائی جنون کا حاصل ہے۔ محبت ایک کیفیت ہے جس میں اطمینان موت ہے۔ محبت لمحہ ہے جس میں صدیوں جیا جا سکتا ہے۔

کائنات کی کوئی بھی چیز لا حاصل نہیں ہے سوائے خواہشات کے ٹمٹماتے جگنوؤں کے، جن کے پیچھے بھاگتے بھاگتے انسان موت کی وادی میں اُتر جاتا ہے

ایک بات سوچ کر دوسری بات کرنے سے پہلے تیسری بات از خود حوالہ بن جاتی ہے۔

خوش رہنے کے لیے دوسروں کو پریشان کرنا اتنا ہی ضروری ہے جتنا دوسروں کو خوش رکھنے کے لیے خود کو بیزار رکھنا۔

مجھے لوگوں میں دلچسپی نہیں ہے میں خود میں دلچسپی لیتا ہوں۔

مجھے کسی کے سہارے کی ضرورت نہیں ہے، میری ذات میرے وجود کا سہارا ہے۔

مجھے خدا سے خوف نہیں آتا کیونکہ خدا کوئی مافوق الفطرت ماورائی چیز نہیں ہے، جس سے خوف آئے۔ خدا تو میری تخلیق کا حوالہ ہے۔ خدا کا میرے ساتھ ایسا ہی رشتہ ہے جیسا ایک ماں کا اپنے شیر خوار بچے کے ساتھ ہوتا ہے جسے جنم دے کر ماں اپنے وجود پر گزرنے والی موت کو شکست دے کر اپنی محبت بچے پر واضح کر دیتی ہے۔

شاخوں کی سانسوں میں جب میں اپنی سانس اُنڈیلتا ہوں تو کلیاں چٹک کر پھول بن جاتی ہیں، پتے لہلانے لگتے ہیں، شاخیں جھک کر آداب کرتی ہیں اور میں ان سے چمٹ کر بغل گیر ہو جاتا ہوں، یوں لگتا ہے جیسے ماں نے گال پر تھپکی دے کر گود میں چھپا لیا ہو۔

زندگی سمجھنے اور سمجھانے کا نام نہیں ہے۔ یہ آنے اور جانے کا نام نہیں ہے۔ یہ بچھڑنے اور ملنے کا نام نہیں ہے۔ یہ حاصل اور لاحاصل کی کسک نہیں ہے۔ یہ معیار اور پست و بلند کا احساس نہیں ہے۔ زندگی ایک میٹھا پھل ہے جسے زبان کی لطیف حس سے محسوس کیا جا سکتا ہے۔

سب سے برا شخص میں ہوں کیونکہ میں ہی سب سے اچھا ہوں۔

زندہ رہنے کے لیے سانس کا متحرک رہنا ضروری ہے، کچھ لوگ مر کر بھی زندہ رہتے ہیں، حالاں کہ ان کی سانس متحرک نہیں ہوتی۔

اپنے باطن میں جھانک کر دیکھو، قدرت کا کھیل ایک میلے کی صورت بازار لگائے آپ کی دید کا منتظر ہے۔

لوگ ظالم نہیں ہوتے ہم خود کو مظلوم سمجھ کر ان کی ہمدردی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

مجھے زخم پسند ہیں کیونکہ زخم پھول کی طرح مہک دیتے ہیں۔

کچھ رشتے قمیض کے بٹن کی طرح سانس سے چپکے رہتے ہیں حالانکہ ہم کبھی انھیں استعمال نہیں کرتے مگر پھر بھی یہ قمیض کی طبعی عمر تک اس کے ساتھ وابستہ رہتے ہیں ۔اس اُمید پر کہ شائد کبھی ہماری ضرورت پڑ جائے، اس لیے وہ خود کو قمیض کے وجود سے جدا نہیں کرتے، بس یونہی عمر گزار دیتے ہیں، مر جاتے ہیں، فنا ہو جاتے ہیں اور ایک احساس چھوڑ جاتے ہیں کہ رشتے اس طرح نبھائے جاتے ہیں، کسی کے لیے عمر ایسے گزاری جاتی ہے، جان ایسے دی جاتی ہے اور فنا اس طرح ہوا جاتا ہے۔

کچھ جملے ، کچھ الفاظ، کچھ باتیں، کچھ رویئے، کچھ عادتیں ہماری زندگی کا حصہ بن جاتی ہیں جو سانس کی طرح ہمارے وجود میں متحرک رہتی ہیں، ان سے نجات ممکن نہیں ہوتی، بس ان سے سمجھوتہ کر کے زندگی کے معاملات میں اعتدال برقرار رکھا جا سکتا ہے۔

آزادی محض وجود کی آوارگی کا نام نہیں ہے۔ آزادی احساس کا نام ہے، جس کی سانس ضمیر کے جھرنے سے سیراب ہوتی ہے۔

خوش رہنے کے لیے خود کو مار ڈالو، ورنہ لوگ تمھیں اندر سے مار ڈالیں گے۔

سب سے بڑا دشمن انسان اپنی ذات کا ہوتا ہے جسے فقط عارضی خواہش کی تسکین کی خاطر شرمندہ کرتا رہتا ہے۔

امتحان تو اللہ کا اپنے بندے سے ہوتا ہے۔ بندہ تو خدا پر کسی طرح مطمئن ہو جاتا ہے لیکن خدا بندے کو مطمئن کرنے میں بعض اُوقات ناکام رہتا ہے۔

جب کوئی چیز، خواہش یا کوئی آرزو انسان کے مقدر سے ہٹا دی جاتی ہے تو اس کی آسودگی کا خیال انسان کے وجود کو کرب میں مبتلا کر دیتا ہے۔ پھر ہر خیال، خواہش حتیٰ کہ سانس تک بھی انسان کے سینے میں ایک اندوناک چُبھن پیدا کرتی ہے، جس سے فرار نصیب نہیں ہوتا۔

شادی شدہ مرد بہت چالاک ہوتا ہے، اپنی پہلی محبت کو دوسری کا رنگ دے کر اسے بہانے سے ملتا ہے۔ اس کی گفتگو کرتا ہے، لیکن کبھی سینہ ٹھوک کر اپنی بیوی سے اظہار نہیں کرتا کہ مجھے تمھارے سوا کوئی اور دکھائی نہیں دیتا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اسے احساس کے آئینے میں بیوی کا وجود کہیں نظر ہی نہیں آتا۔ رسمی بیوی میں عیب ڈھونڈ کر اپنی محبت کی تسکین کے پیش نظر مرد ہر وہ جھوٹ بولنے اور دُھوکا دینے کی کوشش کرتے ہیں جو محض عارضی سی جنسی خواہش کے حصول میں سازگار واقع ہو۔ مدت بیت جاتی ہے اس تعلق اور لاتعلق کے دُھندلے سے سفر میں، نہ وہ خود اپنا رہتا ہے نہ بیوی کا اور نہ ہی کسی اور کا بن پاتا ہے۔ گویا اپنی ذات، بیوی اور محبت کے درمیان معلق ہو کر رہ جاتا ہے، زندگی گزرتی رہتی ہے۔

دُنیا میں کوئی کام اس وقت تک مشکل ہوتا ہے جب تک اسے مشکل سمجھا جائے۔

دُنیاوی عبادت ایک عادت ہے جس میں لذت کا احساس نہیں ہوتا۔

دولت کے لیے انسان خود کو بیچ ڈالتا ہے لیکن خود کو خریدنے کے لیے دولت خرچ نہیں کرتا۔

رزق پیٹ میں ڈالنے والی خوراک یا بدن پر زیب تن والا لباس نہیں ہے۔ رزق خدا کی لاحاصل محبت ہے جس میں خدا کی بے نیازی اور بندے کی خودداری کا امتحان ہوتا ہے۔

ہم ایک زندگی کو دوسری زندگی کے حصول پر قربان کر دیتے ہیں لیکن زندگی کو ایک مختصر سفر سمجھ کر گزارنا پسند نہیں کرتے۔

میں ہر دن محض اس لیے ضائع کرتا ہوں کہ آنے والا دن اس سے بہتر ہوگا۔

زندگی ایک بھکاری کی طرح ہے جسے کسی دروازے سے خیرات، کسی سے دلاسا، کسی سے پھٹکار اور کسی سے محض بہلاوا ملتا ہے

ہم لوگوں کو سمجھنے کے لیے ایک عمر گزار دیتے ہیں لیکن خود کو سمجھنے کے لیے ایک پل سوچنا بھی گوارا نہیں کرتے۔

انسان بڑا عجیب جانور ہے، اسے ہمیشہ کسی دلاسے، کسی سہارے، کسی ہمدردی کی ضرورت رہتی ہے حالاں کہ یہ آزاد اور خود مختار ہے۔

دوسری، تیسری یا پھر چوتھی شادی کرنا کوئی گناہ نہیں ہے لیکن پہلی، دوسری اور تیسری بیوی کو بھی اسی طرح ان کی سابقہ محبت سے ملا دینا چاہیے، جس طرح مرد پہلی، دوسری، تیسری بیوی کے وجود سے وصال کی تسکین کے بعد اپنی پہلی، دوسری یا تیسری محبت کی محبت کو نہیں چھوڑ سکتا۔ جسم کی لذت کا احساس محض جسمانی تبدیلی سے ممکن نہیں ہوتا۔ جسمانی لذت روح کی لذت سے متخالف ہوتی ہے۔ روح کی تسکین صرف ربوبیت کے عشق میں پنہاں ہوتی ہے اور نفسانی لذت جسم کی لذت میں پروردہ ہوتی ہے۔ جسمانی محبت کے لیے روحانی محبت کو چھوڑا جا سکتا ہے لیکن جسمانی محبت کے لیے جسم کی تبدیلی کی خواہش کرنا ایک مرد کے شعور کی انتہائی پست ترین سطح ہے جس میں اگر ایک بار پاؤں پھسل جائے تو پھر عمر بھر کبھی بامِ روحانی کا زینہ ہاتھ میں نہیں آتا۔ جسمانی لذت کی اذیت بعض دفعہ روحانی تسکین کی لذت سے ہمیشہ کے لیے محروم کر دیتی ہے۔

سچ اور جھوٹ میں فیصلے کا اختیار اللہ کو ہے۔ انسان جب اس فیصلے کو اپنے ہاتھ میں لیتا ہے تو رشتوں کو تباہ کر ڈالتا ہے کیونکہ اس فیصلے میں اس کی ذاتی انا شامل ہوتی ہے جو درست فیصلہ کرنے کی ہمت پست کر دیتی ہے۔

مجھے فرشتہ بننے کی ضرورت نہیں ہے میں انسان بن جاؤں تو خدا مجھ سے آ ملے گا۔

زندگی میں ہر چیز، انسان کے اختیار میں نہیں ہوتی، کچھ چیزیں محض دلاسے اور بہلاوے کے لیے ہوتی ہیں۔

کچھ لوگ ہماری زندگی میں محض اس لیے آتے ہیں کہ ہم انھیں جی بھر کر چاہتے رہیں۔

جو وقت گزر جاتا ہے وہ ویسے ہی گزرنا تھا جیسے گزرا ہے۔ گزرے ہوئے وقت کو دُہرا کر دوبارہ اپنے طریقے سے گزارنا ایسے ہی ہے جیسے ہوا کو مٹھی میں بند کر کے ہوا کے دوش پہ اُڑا کر اسے پھر سے مقید کرنا۔

کچھ لوگ ہماری سمجھ میں نہیں آتے، کچھ لوگوں کو ہم سمجھ نہیں سکتے، کچھ لوگ ہمیں سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ یہ سوچ کا اختلاف ہے اس میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔

انسان کی فطرت بڑی عجیب ہوتی ہے۔ یہ ہمیشہ اُن چیزوں کی خواہش کرتا ہے جن تک اس کی رسائی نہیں ہوتی لیکن کچھ چیزوں تک کوشش رسائی کا ذریعہ ضرور بنتی ہے اور کہیں قسمت سے انسان مات کھا جاتا ہے۔

بچے جب جوان ہوجائیں تو انھیں دوست بنالیں وگرنہ یہ نوجوان آپ کو بچہ سمجھ کر نظر انداز کردیں گے، پھر ایک دن فالتو سامان کی طرح کسی سٹور روم میں منتقل کردیں گے۔ حالات اور ہوا کا رُخ دیکھ کر خود کو بدل لینا ہی عقلمندی ہے۔

وقت اچھا ہو یا بُرا گزر تو جاتا ہے لیکن اپنے ساتھ اچھی بُری یادیں نہیں لے کر جاتا صرف احساس دے جاتا ہے جو ماضی بن کر انسان کی روح کو ڈستا رہتا ہے۔

کچھ لوگ ہماری زندگی میں محض اس لیے آتے ہیں کہ ہم انھیں جی بھر کر چاہتے رہیں۔

دِکھاوا ایک آئینہ ہے جس میں درحقیقت ہم اپنی اصلیت دوسروں کو دکھانے کی کوشش کرتے ہیں۔

مجھے کبھی خدا سے کچھ مانگنے کی ضرورت نہیں رہی، وہ میرے دل میں جنم لینے والی ہر خواہش کو بھانپ کر اُسے میرا مقدر کر دیتا ہے۔

اللہ نے ہمارے لیے صحیح اور غلط کا جو نظام بنا رکھا ہے، وہ درحقیقت ہماری زندگی سے عبارت ہے اس سے ماورا کچھ بھی نہیں۔

سائنس جتنی بھی ترقی کر لے وہ خدا کے متعین کردہ اُصولوں میں استخراج واندراج اور اخراج کبھی نہیں کر سکتی۔

کسی شخص کے مستقبل کا انحصار اس کے گھریلو حالات، عمدہ گھر، دولت اور زمین سے نہیں ہوتا۔ اس کے اپنے کردار، رویے اور تعمیری صلاحیتوں پر ہوتا ہے۔

پیار محبت عشق جیسے معتبر اور پاکیزہ الفاظ آج گالی سی معلوم ہوتے ہیں۔ شاید جدید دور کے ماڈرن بچوں نے ان الفاظ کی پاکیزگی اور لطافت کو گہری نگاہ سے اب تک دیکھا اور محسوس ہی نہیں کیا۔ جو پیار اور محبت آج کے زمانے میں رائج ہے یہ تو فقط ایک عارضی، جذباتی سا تعلق ہے جسے کچھ عرصہ تک برقرار رکھا جاتا ہے پھر جنسی آسودگی کے بعد اس رشتے کے وجود سے واقفیت کا تعلق توڑ لیا جاتا ہے پھر کسی اور تعلق کی تلاش شروع ہو جاتی ہے۔ پیار محبت اور عشق کا سلسلہ تو احد و احمد کی لازوال محبت کا سلسلہ ہے۔ محبت، پیار اور عشق دراصل انسان کی قلبی و روحانی ارتقا کی منازل ہیں جن تک رسائی کے لیے نفس کشی، ضبط نفس، اطاعت بندگی اور اطاعت الوہیت کی منازل طے کی جاتی ہیں۔ پیار ایک پھول کی مانند ہوتا ہے جس میں محبت خوشبو بن کر اس کے دامن میں رچی بسی ہوتی ہے۔ پیار محبت اور عشق کسی مجسم وجود، ہیت یا عنصر کے ساتھ مخصوص نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ایک محرک ہے، ایک جذبہ ہے، ایک کسک ہے، ایک درد ہے، ایک لمحہ ہے، ایک کیفیت ہے، ایک خیال ہے، ایک تصور ہے، اور نا جانے اس کی کتنی شکلیں ہیں، کتنے رنگ ہیں، کتنے سُر ہیں، یہ جھرنے کی طرح بلندی سے پستی کی جانب چشمے کی طرح بہتا سوکھے کھلیانوں کو سیراب کرتا ہے۔ پیار، محبت اور عشق جیسی کیفیات کو وقت کے دامن میں مقید نہیں کیا جا سکتا۔ اسے لفظوں میں سمویا نہیں جا سکتا۔ اسے زنجیروں میں باندھا نہیں جا سکتا۔ یہ زمین و آسمان کی وسعت اور کنج تنہائی کی تنگ دامانی میں قیام نہیں کر سکتا۔ پیار، محبت اور عشق دراصل انسان کے ارتقا کی منازل ہیں جنھیں انسان کبھی مجاز اور کبھی حقیقت کے در وا ہوتے دیکھتا ہے۔ پیار، محبت اور عشق میں نہ جیت ہوتی ہے، نہ مات ہوتی ہے، اس میں کچھ کھویا جاتا ہے

، نہ کچھ پایا جاتا ہے۔ پیار، محبت اور عشق کو خود ساختہ اختیار بھی نہیں کیا جا سکتا۔ یہ منہ زور ہوتا ہے، انا پرست ہوتا ہے۔ ضدی ہوتا ہے۔ خود غرض ہوتا ہے۔ اس سے زیادہ عاجز اور خاکسار بھی کوئی نہیں ہوتا۔ یہ محلوں کو کھنڈر بنا دیتا ہے۔ یہ صحراؤں میں نچوا دیتا ہے۔ یہ سولی پہ لٹکا دیتا ہے۔ یہ درباروں میں کوڑے لگواتا ہے۔ یہ بازاروں میں بھیک منگوا دیتا ہے۔ پیار، محبت اور عشق انسان کے روپ ہیں۔ ان کیفیات میں انسان کا روحانی پیکر پنہاں ہوتا ہے جس کا ظہور پیار، محبت اور عشق کے پہناوے سے جلوہ گر ہوتا ہے۔ پیار، محبت اور عشق محض الفاظ نہیں ہے۔ پیار، محبت اور عشق محض الفاظ نہیں ہے۔

اُمید کو ڈھونڈا نہیں جاتا اسے دل کے آنگن میں سنبھال کر رکھا جاتا ہے یہ بیج کی طرح ہوتی ہے جو چند دن بعد زمین کے سخت وجود کو چیر کر باہر تو آ جاتی ہے لیکن اسے ایک تناور درخت بننے میں بہت وقت درکار ہوتا ہے لیکن یہ اُمید بیج سے درخت تک کا سفر ضرور طے کرتی ہے اگر اسے پانی دیا جاتا رہے اور اس کے پیڑے کی صفائی ستھرائی اور کانٹ چھانٹ مسلسل کی جاتی رہی۔

سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ انسان کسی کی تعریف کرے اور خود پر شرمندہ ہوتا جائے۔

ہر ساس عورت ہی ہوتی ہے اور ایسا نہیں ہے کہ اس کے پاؤں میں کانٹے نہ ہوں اور اس کے ساتھ مصیبتوں کا ڈھیر نہ ہو۔ خوشی پلیٹ میں رکھ کر نہیں ملتی۔ زندگی میں تلخی اور کڑواہٹ ماحول اور حالات کی ناسازگار فضا کے عدم توازن سے پیدا ہوتی ہے اور پھر عورت معاشرتی ذمہ داریوں کا بوجھ برداشت کرتے کرتے آخر ایک ذمہ داری بن کر رہ جاتی ہے۔ اس ذمہ داری کی تھکن اس کے وجود کو گھائل کر دیتی ہے اور وہ ایک سوکھے ہوئے شجر کی صورت اختیار کر جاتی ہے جس پر ہمدردی اور اپنائیت کی بارش بہت کم اور ظلم و زیادتی کے طوفان اکثر برس کر اپنے گہرے اثر چھوڑ جاتے ہیں جن کے نقش عمر بھر کسک و کرب میں رکھتے ہیں اور یہی کسک اور بے قراری کا رویہ وہ اپنی بہوؤں کے ساتھ رکھتی ہیں جس میں اس کی خواہش بہت کم اور ماضی کی تلخ پرچھائیاں کا اثر زیادہ ہوتا ہے ورنہ ساس بھی بہو ہوتی ہے جو ایک طویل امتحان کے بھنور سے گزر کر ساس کے مرحلے تک پہنچتی ہے۔

جانوروں اور مجھ میں بس اتنا فرق ہے کہ میں بولتا اور کھاتا ہوں وہ صرف کھاتے ہیں۔

کچھ لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ ہمیشہ دوسروں کے رویوں پر تنقید کرتے رہتے ہیں۔ آپ اس عادت کا حصہ بننے کی بجائے ان کی عادت کا سامان مہیا کریں۔

پہاڑوں اور جنگلوں میں جانور رہتے ہیں، گاؤں اور شہروں میں انسان رہتے ہیں۔ ان دونوں میں فرق کیا ہے؟

کامیابی کے لیے مستقل مزاج ہونا ضروری ہے اور ناکامی کے لیے بدمزاج ہونا ضروری ہے۔

پھوہڑ سے پھوہڑ عورت بھی گوشت پکائے گی تو ذائقے میں فرق نہیں آئے گا۔ ماں جاہل ہو تب بھی انسان کے معاشرتی معیار میں فرق نہیں آتا۔

انسان جب شادی کے بندھن میں بندھ جاتا تو پھر چاہے باہم کتنی ہی تلخی کیوں نہ بڑھ جائے، گلے شکوؤں کا انبار ہی کیوں نہ ذہن کے دوش پر سوار رہے، اپنے ہم سفر سے نفرت نہیں کی جاسکتی، اس سے بے اعتنائی اور بے رُخی نہیں برتی جاسکتی کیونکہ شادی ایک احساس کا نام ہے جس کا تعلق روح کے قلب سے وابستہ ہوتا ہے۔ وجود کا رشتہ تو پہلی رات وصال کے بعد اپنی انتہا کو پہنچ کر ایک سنہری یاد بن کر غروب ہو جاتا ہے لیکن روح کا تعلق ہمیشہ ہرے بھرے سرسبز کھیت کی طرح لہلہاتا رہتا ہے، جس پر کبھی بادل گرجتے ہیں، دُھوکا اور دکھاوا سا بن کر کچھ دیر بہلاوے میں ڈالے رکھتے ہیں لیکن جب برستے ہیں تو قُربتوں کے درمیان حائل صدیوں جیسے فاصلے بھی لمحوں میں رُخ بدل کر روح کی تسکین بن جاتے ہیں۔

دُودھ پینے سے اگر ہڈیاں مضبوط ہوسکتی ہیں تو گھاس کھانے سے بکری شیر بھی بن سکتی ہے۔

پاگل بننے کے لیے ضروری ہے کہ ایسا کام کیا جائے جو زمانے کے اعتبار سے نامعقول ہو لیکن مبنی بر حقیقت ہو۔

محبت کے لیے کسی خاص دل، احساس، رشتے یا شخص کی ضرورت نہیں ہوتی، بس اک نظر کی ضرورت ہے۔

دُنیا میں سب سے مشکل کام لوگوں کو اپنے نظریات سے مطمئن کرنا ہے۔

مسلسل ناکامیوں کے بعد ملنے والی کامیابی مزید ناکامی کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔

کبھی کبھی نیکی اُلٹا گلے بھی پڑ جاتی ہے جسے نبھانے کی سکت انسان میں نہیں ہوتی اور بسا اوقات بے وقت کا دفاع عمر بھر کا روگ بن جاتا ہے جو اکتاہٹ کے احساس سے پچھتاوے کی پھانس بن کر شہ رگ میں پیوست ہو جاتا ہے جس سے سانس لینا دو بھر ہو جاتا ہے۔ ایسے میں خاموشی اور تحمل سے صبر کرنا ذریعہ نجات کا موجب بنتا ہے جو بہت طویل بھی ہو سکتا ہے اور بہت مختصر بھی۔

قسمت کا انحصار حالات کے موزوں ترین مزاج پر منحصر نہیں ہے، یہ اللہ کی رضا اور اس کی تقسیم کا منفرد نظام ہے، جو رشتوں، آزمائشوں، امتحانوں، ناکامیوں، کامیابیوں، محرومیوں اور سیرابیوں کی صورت انسان کے سامنے جلوہ گر ہوتا ہے۔ اللہ کی تقسیم میں نقص نکالنے اور گلہ شکوہ کرنے سے قسمت کو انسان اپنی خود ساختہ خواہشات کے مطابق ڈھال نہیں سکتا۔ اسے تسلیم کرنے اور قبول کرنے میں بہت باریک سا فرق ہے۔ تسلیم کر لینے سے کوئی گلہ نہیں رہتا اور قبول کر لینے سے روحانی تسکین مل جاتی ہے۔

بڑا آدمی بننے کے لیے باطن میں چھپے ہوئے چھوٹے انسان کو باہر نکالنا ضروری ہے۔

انا کا کتا باطن کے آنگن میں پال کر رکھنے سے رحمت کے فرشتے دل کی چوکھٹ پر منتظر کھڑے رہتے ہیں، اندر داخل نہیں ہوتے۔

غریب انسان امیر بننے کے لالچ میں غریبی کے لطف سے محروم ہو جاتا ہے۔

امیر بننے کے لیے فقیر بننا ضروری ہے۔

فقیر بننے کے لیے دل کی بستی میں حُبِ خدا کا دیا خونِ جگر سے روشن رکھنا پڑتا ہے۔

میں اکثر سنتا ہوں کہ ایک عورت دوسری عورت کا وجود اپنے دوست یا شوہر کے ساتھ برداشت نہیں کرسکتی۔ایسا کچھ نہیں ہے، یہ صرف ہماری مشرقی سوچ اور ادب کے وہ قدیم تصورات ہے جنھیں جدت کا نام دے کر میڈیا اور مختلف ٹی وی چینلز میں دکھا کر اس روش کو مزید پختہ کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔دراصل یہ ایک جذباتی، انا کی تسکین، معاشرتی رکھ رکھاؤ اور ذہنی خودساختہ رویئے کا نام ہے جس کے چنگل میں ہماری خواتین پچھلی کئی صدیوں سے پھنسی ہوئی ہیں اور آج جدت اور تجدید جدت کے ہمنوا ممالک کے باشندے بھی اس خصلت اور ذہنی خلفشار سے عورتوں کو باہر نکالنے کی بجائے مزید انھیں بدگمانی اور عدم توازن کے حامل رشتوں کے بھنور میں انھیں پھلنے کا مواقع فراہم کررہے ہیں۔عورتوں کو چاہیے کہ اس ذہنی خلفشار میں کودنے کی بجائے شعور اور آگاہی سے کام لیں اور باہمی محبت و یگانت کے ماحول کو سازگار کرنے میں اپنا کلیدی کردار ادا کریں۔

خدا کو سمجھنے کی ضرورت نہیں ہے، جیسے باپ کا ہر فیصلہ (بعض اوقات) ہمارے حق میں نہیں ہوتا ایسے ہی خدا کی حکمت ہمارے مشورے اور خواہش کی محتاج نہیں ہوتی۔خدا کی حکمت اور قدرت عقل کی تفہیم سے بہت ماورا ہے۔اس کی توضیح کھوجنے کی بجائے اس کی تعمیل کرنی چاہیے۔

بے جان چیزوں میں لمس کی حس بہت فزوں تر ہوتی ہے۔یہ بڑی سرت سے مانوس ہوجاتی ہیں۔

میں نافرمان ہوں۔کیا آپ بھی میرے باپ کی طرح مجھے نکال باہر کریں گے؟؟؟ ہر اُولاد تھوڑی نافرمان اور بت میز ضرور ہوتی ہے، کیونکہ والدین تھوڑے ہٹ دھرم اور انا پرست ہوتے ہیں۔

ہر ماں اپنی ماں کو جنم دیتی ہے اسی طرح ہر باپ اپنے باپ کو جنم دیتا ہے، جس کا احساس ماں کو اپنے بڑھاپے اور باپ کو شباب کے اختتام پر ہوتا ہے۔

سب باتیں سمجھ میں نہیں آتی، کچھ باتیں مبہم ہوتی ہیں جنھیں سمجھنے کی ضد بعض دفعہ سمجھ کی حس سے محروم کردیتی ہے۔

محنت کرنے کا نہ کوئی معیار ہے، نہ کوئی حد ہے۔ اس کو وقت کے تابع نہیں کیا جاسکتا۔ محنت انسان کی پیدائش سے لے کر وفات تک محیط ہوتی ہے۔ زندگی میں کئی موڑ ایسے آتے ہیں جب ہم اپنی ذات پر مطمئن ہوتے ہے۔ یہ اطمینان دولت کی فراوانی کا مظہر تو ہوسکتی ہے لیکن محنت کا تسلسل نہیں ہوتی۔ محنت کی نہ کوئی ابتدا ہے اور نہ کوئی انتہا۔ یہ ایک اپنا مزاج رکھتی ہے۔ اس کے اپنے تیور ہیں۔ یہ بڑی نک چڑھی اور اکھڑ ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ سمجھوتہ کرنا انسان کو مشکل میں ڈالے رکھتا ہے۔ اس کی شہ رگ تک ہاتھ نہیں پہنچ سکتا۔ اس کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھنے والا اندھا ہو جاتا ہے۔ اس کے بدن کی تراش خراش کا عمل خود ساختہ نہیں بلکہ غیر فطری ہوتا ہے۔ یہ اپنے رنگ اور ڈھنگ میں مگن رہتی ہے۔ اسے کسی سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ اس سے جڑنے والا ہمیشہ آباد رہتا ہے۔ اس سے بچھڑنے والا بربادی پہ نوحہ خواں رہتا ہے۔ محنت کی کوئی نفسیات نہیں ہوتی ۔ اسے بلیک میل نہیں کیا جاسکتا۔ یہ غیر جانبدار ہوتی ہے۔ اسے خریدا نہیں جاسکتا۔ اسے بیچا نہیں جاسکتا۔ یہ یکتائی کی حامل ہوتی ہے۔ اسے دوئی میں مقید میں کیا جاسکتا۔

پڑھا لکھا ہونا بہت ضروری ہے لیکن محض پڑھا لکھا ہونا کافی نہیں۔

کتابوں کی دوستی میں فائدے کے ساتھ تھوڑا نقصان بھی ہوتا ہے لیکن یہ تھوڑا نقصان بہت فائدے سے بہتر ہے۔

ان پڑھ اور جاہل گھرانے میں ایک فرد کے پڑھ جانے سے فقط اتنا فرق پڑتا ہے کہ پڑھا لکھا بھی ان پڑھ اور جاہل ہو کر رہ جاتا ہے۔

بہنیں، کوئل اور بلبل کی طرح ہوتی ہیں جن کی آواز کے سحر میں مدہوش ہو کر بھائی اکثر ان کے وجود کے تحفظ سے غافل ہو جاتے ہیں۔

بھائی، ویران جنگل میں اُس مسافر کی طرح ہوتے ہیں جس کی رفاقت میسر آجائے تو معاشرتی جنگل کے خونخوار اور وحشی جانوروں سے تحفظ مل جاتا ہے۔

انسان امیر ترین خاندان میں پیدا ہو یا پھر غریب ترین خاندان میں۔ امیر ترین خاندان میں پیدا ہونے سے انسان دُنیاداری کے تقاضوں سے ماورا رہتا ہے، مستی اور دولت کے نشے میں زندگی کی تلخیوں اور کڑواہٹوں سے محفوظ رہتا ہے۔ غریب ترین خاندان میں پیدا ہونے سے زندگی کی تفہیم کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ روٹی کے ٹکڑے کا حصول اس کی متاعِ جاں کا سامانِ جلوہ بن کر اس کی سانسوں کو متحرک رکھنے کا حوالہ بنا رہتا ہے۔ اسے نہ کوئی خواب آتا ہے نہ کسی اجنبی تعبیر سے ہم آغوش ہونے کی خواہش ہوتی ہے۔ یہ دونوں انتہائیں ہیں۔ مڈل کلاس یا متوسط گھرانے میں پیدا ہونے والا شخص ہمیشہ خوف اور پریشانی کے عالم میں مبتلا رہتا ہے۔ خوشی اور غم میں ایک ایسی بے یقینی کی کیفیت تسلسل اختیار کر جاتی ہے کہ اس کی گرہ ٹوٹتی ہی نہیں۔ متوسط گھرانے سے تعلق رکھنے والا شخص امیر ترین خاندان کے افراد کو اپنا آئیڈل بنا لیتا ہے اور عمر بھر امیری کی زندگی جینے کے لیے متوسط درجے کی الم ناک زندگی سے بیزار رہتا ہے۔ یہ کبھی بھی غریب نہیں ہونا چاہتا۔ گویا یہ امیری کے مزے سے بھی محروم رہتا ہے اور غریبی کی لذت سے بھی محظوظ نہیں ہو سکتا۔ عجیب بات ہے! ہم اللہ کی تقسیم کو قبول نہیں کرتے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہم کو تخلیق کرنے کے بعد ہمیں ہماری خواہش کے مطابق دُنیاوی درجات میں تقسیم کیا جاتا۔ جس طرح ہم چاہتے تھے ویسا بنایا جاتا۔ سوال یہ ہے کہ اگر اللہ سب کو امیر ترین بنا دیتا تو کیا ہوتا؟ اگر سب کو غریب ترین بنا دیتا تو کیا ہوتا؟ اگر سب کو ایک جیسا، ایک سا، ایک طرح کا بنا دیتا تو کیا ہوتا؟ یہ اللہ کی تقسیم ہے اور اس تقسیم میں چھپی حکمت کو اللہ ہی جانتا ہے۔ اللہ کی حکمت ہماری محدود عقل میں نہیں آسکتی۔ لامحدود اگر محدود میں سما جائے تو لامحدود کچھ نہیں رہتا۔ اللہ کو سمجھنے اور

اس کا ادراک حاصل کرنے کے لیے اس کی تقسیم میں نقص مت نکالیں۔ اللہ کو اپنا کام کرنے دیں اور آپ اپنا کام کریں۔ جب خالق مخلوق کے کسی کام میں مداخلت نہیں کرتا تو مخلوق خالق کے کام اور نظام میں مداخلت کیوں کرتی نظر آتی ہے؟؟

دُنیا چاہے جتنی بھی ترقی کر لے انسان وہی پرانا ہی رہے گا۔

وقت ایک خوبصورت دوشیزہ کی آنکھوں کی جھپک ہے جس میں کائنات کے سب منظر آشکار ہو کر نظر سے اُوجھل ہو جاتے ہیں۔

میں کسی کے لیے نہیں روتا کیونکہ میرے رونے سے مسکرانے والا مزید متبسم نہیں ہو سکتا۔

ہر شخص کی عزت کرنا اتنا ہی ضروری ہے جتنا خدا کے آگے سرنگوں رہنا، کیونکہ خدا انسانوں کے رُوپ میں اکثر انسان کا امتحان لیتا ہے۔

اکثر لوگ خدا کی حکمت اور تقسیم کا گلہ کرتے ہیں، جیسے ان لوگوں پر خدا نے ظلم کر رکھا ہو۔ کیا اللہ کسی پر ظلم بھی کرتا ہے؟؟

میں لمحوں میں قید ایک ایسا پرندہ ہوں جسے لمحوں نے ایک ایسی جگہ ٹانک دیا ہے، جہاں ایک ہی منظر دکھائی دیتا ہے، ایک ہی چہرہ ، ایک ہی رُخ، ایک ہی روپ عورت کا دکھائی دیتا ہے۔ ایک ہی جذبہ میرے ہر جذبے پر حاوی ہے۔ ایک عورت کی بے وفائی کا جذبہ، جس کی اذیت نے میرے باطن میں موجود نمو کے ہر عنصر کو راکھ کر دیا ہے۔ وقتِ پرواز نے میرے سب پر توڑ دیے ہیں اور پھڑ پھڑا کر خود میں نے اپنے وجود کو منتشر کر دیا ہے۔ اب زندگی مجھے گزار رہی ہے میں زندگی کو نہیں گزار رہا۔ یہ زندگی کی رواں سانس کس وقت، کب اور کس حالت میں تھم جائے، کوئی علم نہیں ہے۔ بس اتنا جانتا ہوں کہ دریا میں محبت کی موجیں زیادہ دیر تک ایک ہی رُخ بہتی رواں رہیں تو منجمد تالاب کی صورت اختیار کر جاتی ہیں جس میں یادوں کی گہری جھیل اوندھے منہ دیوانگی کی آغوش میں اُتر جاتی ہے۔ لمحوں کی مقید سانسیں صدیوں کی وسعت میں بھی کنجِ تنہائی کی اسیر ہو کر رہ جاتی ہیں۔ جس سے فرار ممکن نہیں رہتی۔

حقیقت تک پہنچنے کے لیے ضروری ہے کہ حقائق کو شک کی نگاہ سے دیکھا جائے۔

اُولاد والدین کے لیے زندگی گزرانے کا ایک بہترین مشغلہ ہے، کوئی بوجھ یا لازمی فریضہ نہیں جس کی ادائیگی میں خدا کے حقوق کی ادائیگی پامال کر دی جائے۔

دُنیا میں پیدا ہونے کے لیے ایک مرد اور عورت کی باہم رضامندی ضروری ہے لیکن اللہ اس رضامندی کا محتاج نہیں وہ مرد کے بغیر بھی پیدا کر سکتا ہے۔

بعض لوگ حق کے نام پر فرض کو نظرانداز کر دیتے ہیں۔ بیدار رہ کر نصیب سے محروم ہو جانا کتنی بدنصیبی ہے۔

اُولاد پیدا کرنا بہت آسان کام ہے، اسے پالنا اور بڑا کرنا اس سے بھی زیادہ آسان ہے لیکن اُولاد کو باشعور اور بااختیار شہری بنانا مشکل ترین کاموں میں سے ایک ہے۔

بعض اُوقات ماں اپنے خاوند اور بچوں کے درمیان محبت اور خلوص کا موازنہ کرنا شروع کر دیتی ہے، جو اسے بچوں کے قُرب اور خاوند کی محبت سے دور کر دیتا ہے۔ وقت بچوں کو پر لگا کر گھونسلے سے اُڑ جانے کی پرواز سکھا دیتا ہے اور ماں اپنے تنہا گھونسلے کے تنکوں کو سمیٹے ماضی کے اُن لمحوں کو یاد کرتی ہے جب اس نے اپنے خاوند کو بچوں پر ترجیح دینے کا رویہ شدت سے اپنایا تھا۔ بچے خاوند اور بیوی کی محبت کے درمیان ایک پل کا کام کرتے ہیں۔ ماں یا باپ کو کبھی بھی اپنی اولاد کو اپنے رشتے کی مضبوطی کا سہارا تسلیم نہیں کرنا چاہئے بلکہ اُولاد کی اچھی تربیت اور پرورش کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو کر باقی ماندہ زندگی ایسے گزارنی چاہئے جیسے شادی کے اوائل دن گزارے تھے۔ اُولاد کا سہارا انسان کو بعض دفعہ اپاہج بنا دیتا ہے۔

کسی انسان کو مارنے سے پہلے یہ سوچ لیں کہ اس نے ایک دن تو مرنا ہی ہے، کیوں نہ اسے اسی دن کے انتظار میں منتظر چھوڑ دیا جائے

جب میں بہت دُکھی اور غم زدہ ہوتا ہوں تو بہت سوتا اور کھاتا ہوں اور اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے دُکھ سہ کر سُکھی رہنے کا موقع فراہم کیا۔

پریشانی کے بعد راحت اور خوشی کے بعد غم لازم وملزوم ہیں، ان کے درمیان ایک خفیف سا خلا ہے۔ یہ خلا لمحوں اور صدیوں کے فاصلوں جیسا ہوتا ہے۔

آپ کی زندگی پر بہت لوگوں کا حق ہے۔ جان بوجھ کر کسی کو اپنی ذات سے محروم نہ کریں، اس کی باز پُرس ہوگی۔

اگر کوئی شخص آپ کا ساتھ چاہتا ہے تو اسے مایوس کرنے سے بہتر ہے اسے اپنی زندگی کے کچھ حسین پل مستعار دے دیں، ہوسکتا ہے یہی رفاقت اس کی زندگی اور مقدر کو بدل کر رکھ دے۔

عورت ایک عمر میں آ کر اپنے خاوند کی محبت اور توجہ کی محتاج نہیں رہتی اسے صرف کسی ایسی چیز کی تلاش رہتی ہے جو اسے بچپن کی کھنکھاتی چوڑیوں، باغ کی تیتلیوں اور گلستان کے بھنوروں کی شوخیوں جیسی اداؤں میں مدہوش کر دے، مگر یہ خواہش صرف سوچ کی ذہنی آسودگی کا سامان مہیا کر سکتی ہے، اور کچھ نہیں۔ حقیقت بڑھاپے کی عمر تک پہنچ تک دم توڑ دیتی ہے اور انسان خواہشوں کے بے اختیار گھوڑے کی باگ کو تھامے منزل کے اُس موڑ تک آ پہنچتا ہے جہاں سے واپسی ناممکن ہوتی ہے اور آگے بڑھنے سے خوف آتا ہے۔

مذہب کہتا ہے کائنات اور اس کے تمام متعلقات انسان کے گرد گھومتے ہیں اور سائنس کہتی ہے کہ انسان کائنات اور اس کے متعلقات کے گرد گھومتا رہتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ کائنات اور انسان، خود انسان کے گرد گھومتے ہیں۔ گردش کا یہ سفر انسان کے باطنی اور روحانی سفر کے ساتھ مذہبی، سائنسی اور دینی سفر کی تکمیل کا مظہر ہے۔

یک طرفہ محبت اکثر ناکام اس لیے ہوتی ہے کیونکہ دو یکطرفہ باہم ہونے کی کوشش نہیں کرتے۔

خوبصورت اور حسین لمحات زندگی میں بہت کمیاب ہوتے ہیں انھیں کسی دل خراش واقعے سے جوڑ کر نظر انداز کرنے کی بجائے ان سے محظوظ ہونا چاہیے۔

مجھے ہر دفعہ یہی لگتا ہے جیسے میں کسی بے وقوف حرکت کے پیش نظر خود کو تکلف میں مبتلا کر لیتا ہوں۔ ایسا کرنے سے میں خود کو تکلف دینے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتا۔

زندگی میں کچھ لوگ بہت اہم ہوتے ہیں۔ یہ لوگ احساس بن کر ہمارے ذہن کے اُفق پر آفتاب کی مانند عمر بھر طلوع رہتے ہیں۔ یہ وہ احساس ہے جو ہمیں زندہ رہنے پر آمادہ رکھتا ہے۔

میں نے بہت سی شعوری محبتیں کی ہیں لیکن ان میں سوائے ایک عارضی لذت کے کچھ حاصل نہیں ہوا۔

زندگی میں رشتے بہت اہم ہوتے ہیں۔ انھیں گنوانا نہیں چاہیے۔ ہم انا کے جال میں پھنس کر اپنی خودساختہ غیرت پر حرف نہیں آنے دیتے لیکن ایک ایک کر کے رشتوں کو پامال کرتے چلے جاتے ہیں۔ بڑے اور بزرگ رشتوں کا خیال ہمیشہ رکھنا چاہیے۔ ان معتبر رشتوں کے سامنے اپنی انا کے کردار کو شکست دینے سے انسان بزدل نہیں بنتا بلکہ معاشرے کی نگاہ میں محترم اور معتبر مقام حاصل کر لیتا ہے۔ رشتے بہت اہم ہوتے ہیں انھیں چھوٹی چھوٹی لغزشوں اور شکائتوں کا بہانہ بنا کر چھوڑنا نہیں چاہیے۔ خونی اور خاندانی رشتوں سے آپ کبھی پیچھا نہیں چھڑا سکتے۔ یہ سانس کی طرح انسان کے ساتھ متحرک رہتے ہیں۔ انھیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے ان کے وجود اور اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ایک عاقل اور دانا شخص کبھی بھی ان رشتوں کے درمیان اپنی انا اور خود ساختہ مزاج کو حائل ہونے نہیں دیتا بلکہ اپنے جذبات و احساسات اور خوابوں کی قربانی دے کر انھیں بچا لیتا ہے۔ عاقل اور دانا شخص غلط فہمیوں کی تلخ اور زہر رسیدہ ہوا سے رشتوں کے پاکیزہ دامن کو بچائے رکھتا ہے۔ یہی عقل مندی ہے اور یہی رشتوں کو مضبوط اور مستحکم رکھنے کا مستند طریقہ ہے۔ رشتے بہت اہم ہوتے ہیں۔ رشتوں کی قدر نہ کرنے والے کی معاشرہ کبھی قدر نہیں کرتا۔

ہر دن اس طرح گزر جاتا ہے جیسے یہ دوبارہ پلٹ کر ضرور آئے گا۔ ہر شام یوں لوٹ آتی ہے جیسے اس نے کل نہیں آنا تھا۔ تاریخ سوائے عبرت کے اور کچھ نہیں دیتی۔ ادب معاشرے میں زندہ رہنے کا قرینہ سکھاتا ہے۔

لوگوں کو اپنے قریب کرنے سے بہتر ہے خود ان کے قریب ہو جاؤ۔

سب سے بڑی دولت اپنی ذات پر مطمئن ہونا ہے۔

شاعری روح کی لطافت اور دل کے زخموں کا مرہم ہے۔

والدین اُولاد کو کبھی اس نیت سے پروان نہیں چڑھاتے کہ بڑی ہو کر یہ نافرمان اور خودسر واقع ہوگی۔ والدین کی ڈانٹ ڈپٹ اور سختی سُستی ہماری تربیت کا حصہ ہوتی ہے۔ بعض والدین یہ خشک رویہ اپنی اُولاد کی نفسیات سے آگاہ ہوئے بغیر رکھتے ہیں اور بعض والدین لاشعوری طور پر ایسا رویہ اختیار کرتے ہیں۔ جس کا مقصد محض یہی ہوتا ہے کہ اُولاد کو ضروری چیزوں سے عارضی طور پر محروم کر دیا جائے، تاکہ انھیں چیزوں، رشتوں اور محنت کی عظمت واہمیت کا احساس ہو جائے۔ والدین کا گلہ شکوہ اور ناراضی اُولاد کے لیے ایک تازیانہ کا کام دیتی ہے۔ اب یہ اُولاد پر منحصر ہے کہ وہ اپنی صلاحیتوں کا درست استعمال کرتے ہوئے خود کو معاشرے اور والدین کی نظر میں ایک کامیاب اور قابل فخر شہری بننے میں اپنی تعمیری صلاحیتوں کا درست استعمال کرتے ہیں یا غلط فہمیوں کا لبادہ اُوڑھ کر دُنیا کی رنگینوں اور ذمہ داریوں سے منہ موڑ کر اور زندگی کے حقیقی مقصد سے غافل ہو کر جہالت اور خودسری کے اندھے کنوئیں میں پھلنے کے مواقع تراشتے ہیں۔

قسمت اور مقدر کے پھیر میں دریا کے بھنور جیسا چکر و یو ہوتا ہے اس میں اُلجھنے کی بجائے اپنے ذہن کی تخلیقی گرہوں کو سلجھانے کی کوشش کرنی چاہیے۔

غزل ایک اونی کمبل جیسی ہے جسے شدید جاڑے میں اُوڑھ کر برہنہ روح کی حفاظت کی جا سکتی ہے۔

اطمینان صرف موت دے سکتی ہے لیکن موت کے لیے اطمینان کا ہونا ضروری نہیں۔

زمین موت کو حیات میں بدل دیتی ہے لیکن حیات موت کی محتاج رہنا گوارا نہیں کرتی۔

کچھ خواہشیں بارش کے قطروں کی طرح ہمارے ذہن میں معلق رہتی ہیں۔

کچھ خواب صرف دیکھنے اور دیکھ کر بھول جانے کے لیے ہوتے ہیں۔

کچھ باتیں سُنے بغیر یاد رہ جاتی ہیں، کچھ جملے بار بار دہرانے سے یاد نہیں رہتے۔

کچھ واقعے محض دُھوکا ثابت ہوتے ہیں۔

محبت باٹنے کے لیے نفرت کے کاسے کی ضرورت نہیں پڑتی۔

عورت سے شادی کرنے کے بعد خاوند ہفتے بعد بیرون ملک روانہ ہو جاتا ہے اور بیوی کو زمانے کی گِدھوں، کوؤں اور چیلوں کے حوالے کر جاتا ہے جو اس زخمی ہرنی کے وجود پر ہمدردی کا پھاہا رکھنے کے بہانے اس کا قُرب حاصل کرنے کی کوشش میں اس کے جذبات کے ساتھ ایسا گندہ کھیل کھیلنے کی کوشش کرتے ہیں جس سے اس ہرنی کو اپنی عزت و ناموس کی پاک دامانی کا احساس جھلسا کر راکھ کر دیتا ہے۔ ہمارے مشرقی معاشرے کا یہ المیہ ہے، نوجوان نسل کو اس کے بارے میں سوچنا چاہیئے کہ عورت ایک چراغ کی طرح ہوتی ہے جس کے گرد ایک مضبوط حصار ہونا ضروری ہے وگرنہ زمانے کی تند ہوا اسے پل بھر میں بجھا کر راکھ دے گی۔

عورت کا امتحان اس کی وفاداری سے نہیں ہوتا اس کے صبر سے ہوتا ہے۔

لوگوں کے معیار پر پورا اُترنے کے لیے ہم اپنے وجود کی کُل توانائی اور تعمیری و تخلیقی صلاحتیں صرف کر دیتے ہیں، پھر بھی دُنیا کی نظروں میں ہم وہ مقام حاصل نہیں کر پاتے جس کی خواہش ہمارے ذہن میں سُلگتی رہتی ہے۔ اگر ہم اپنی ذات کو چند خامیوں سمیت قبول کر کے دُنیاداری کے تقاضوں سے منہ موڑ لیں تو یہ دُنیاوی معیار اور رکھ رکھاؤ ہمارے پاؤں کی ڈھول بن جائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ ساری عمر لوگوں کے معیار پر پورا اترنے میں گزر جاتی ہے، لیکن حاصل کچھ نہیں ہوتا۔

محبت جوگ نہیں ہے جسے اختیار کر کے دُنیا ترک کر دی جائے۔ محبت پھل دار درخت ہے جو پتھر مارنے والے کو اپنے دامن سے پھل دیتا ہے۔ محبت روسیاہ درویش ہے جو گالی کھا کے دُعا دیتا ہے۔ محبت سورج ہے جو اپنا دامن جلا کر کائنات کی تاریکی کو روشنی سے منور کرتا ہے۔ محبت عبادت ہے، محبت خدا ہے اور خدا بغیر مانگے عطا کرتا ہے۔

جذباتی رویئے محض بہلاوا ہوتے ہیں انھیں کُریدنے کی بجائے مندمل کرنے سے تسکین ملتی ہوتی ہے۔ انھیں شعوری ضِد بنا کر جیا تو جا سکتا ہے لیکن جینے کا حق ادا نہیں کیا جا سکتا۔

کچھ لوگ اپنی عمر ایک خودساختہ عمر کے معیار کے حصول میں گزار دیتے ہیں لیکن شائد یہ بھول جاتے ہیں کہ عمر کا گزرا ہوا ایک لمحہ بھی جب واپس نہیں آسکتا تو گزری ہوئی تمام عمر لوٹ کر کیسے آسکتی ہے؟ زندگی کا ہر موڑ انسان کی خواہش کے مطابق نہیں ہوسکتا۔ زندگی انسان کو اپنی جبلّت کے مطابق جینے کی مہلت اور مواقع مہیا کرتی رہتی ہے لیکن انسان ان دُھندلے اور مبہم مواقعوں کو نظرانداز کر دیتا ہے اور کسی بڑے انقلاب یا اچھے حالات کی اُمید لیے سانس کی ڈور سے بندھا رہتا ہے۔ زندگی بعض دفعہ خود انسان کی محتاج ہو کر رہ جاتی ہے اور بعض اُوقات انسان زندگی کے ہاتھوں شیر خوار بچے کی صورت سہارے کا منتظر ہوتا ہے۔

زندگی کی تفہیم انسان کے شعور میں وا نہیں ہوسکتی۔ انسان محض اس کائنات کی تکمیل کا حوالہ ہے، جس کے اختیار میں مستعار دی ہوئی کچھ مدت ہے جسے انسان کچھ گنوا دیتا ہے، کچھ بھلا دیتا ہے۔ زندگی اور انسان کے درمیان فقط سانس کا رشتہ ہے۔ اس معمولی سے بے اعتبار رشتے کے لیے انسان عمر بھر نا جانے کن مشکلات اور مصائب سے خود کو دوچار کیے رکھتا ہے۔ لاحاصل کی تلاش میں کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ جو حاصل ہے اس میں حائل ہو کر اس کے قائل بن کر اسے تسلیم کرنے سے کلیم اور علیم تک رسائی ممکن ہے وگرنہ جلیل تر کو ذلیل تر بننے میں بہت تھوڑا وقت لگتا ہے۔

خوبصورت الفاظ کی ادائیگی مہذب زبان سے ممکن ہے۔ چرب زبان الفاظ کو چارہ سمجھ کر نگلتی اُگلتی رہتی ہے۔

لوگوں کو سمجھنے سے بہتر ہے خود کو سمجھو، انسان بن جاؤ گے۔

مجھے بتلانے، سمجھانے اور سکھانے کی ضرورت نہیں، بس حقیقت سے آگاہ کر دو۔

الفاظ خوشنما مرتبان کی طرح ہوتے ہیں جن کے دامن میں حقیقتوں کو صدیوں محفوظ کیا جاسکتا ہے۔

خدا اور مخلوق کے درمیان محض عبادت کا تعلق نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو ہماری تخلیق کی ضرورت پیش نہ آتی۔

الفاظ کا استعمال احتیاط سے کرنا چاہیے۔ الفاظ کا استعمال انسان کی زندگی اور موت کے درمیان تسلسل کا نام ہے۔ الفاظ کا غیر معتدل استعمال اس تسلسل کو بُری طرح متاثر کرتا ہے، بعض اُوقات تو ایک جملہ انسان کی روح پر ایسی کاری ضرب لگاتا ہے کہ اس کا زخم مندمل ہونے میں صدیاں بیت جاتی ہیں۔ الفاظ کا درست استعمال انسان کے جذبات کی پرورش کرتا ہے اور انسان کی روح کی تسکین کا سامان مہیا کرتا ہے۔ الفاظ انسان کی شخصیت کا لباس ہوتے ہیں جنھیں اُوڑھ کر ہم زندگی کے حسین و جمیل لمحات سے محظوظ ہوتے ہیں۔ الفاظ میں شگاف پڑ جائیں تو انسانی قدریں پرانے سکوں کی طرح جیب سے سرک کر کہیں کھو جاتی ہیں جنھیں ڈھونڈنے میں آفتاب وقمر کی روشنی بھی کم پڑ جاتی ہے۔

ہر دن ایک نئے دن کی آمد کا غماز ہوتا ہے۔ ہر رات صبح کے انتظار میں گزر جاتی ہے۔ رات دن کے اس پھیر میں زندگی کا سفر پل بھر میں گزر جاتا ہے۔ زندگی کا سفر اتنا مختصر ہوتا ہے کہ عقل تسلیم کرنے سے ہچکچاتی ہے۔

اگر انسان ہر دن کو اس تصور سے گزارے کہ یہ میرا آخری دن ہے۔ ہر رات آخری رات سمجھ کر زیست کرے تو خواہشوں کے طلسم کدے سے نجات مل جائے گی۔

شادی ایک ریشمی چادر ہے جس پر بدگمانی کی ہلکی سی کی خراش پڑ جائے تو اس کی گرہیں باہم اس قدر اُلجھ جاتی ہیں کہ انھیں چھڑانے کی کوشش میں پوری چادر تار تار کرنا پڑتی ہے۔

کچھ لوگ آپ کی محض اس لیے تعریف کرتے ہیں کیونکہ آپ انھیں پسند ہوتے ہے۔ آپ کو ان کی تعریف کرنے کی ضرورت نہیں۔

والدین اپنی محرومیوں کا حاصل اُولاد سے طلب کرتے ہیں جبکہ اُولاد اپنی ناتمام خواہشوں کی عدمِ تکمیل کا گلہ والدین سے کرتی رہتی ہے۔

موجودہ جدید دور میں عورتوں کی گفتگو کا عام موضوع یہ بن چکا ہے کہ شادی کے بعد مرد بدل جاتے ہیں۔ان کی ترجیحات اور خواہشیں پہلی سی نہیں رہتیں۔ایسا بالکل نہیں ہے۔دراصل ہر عورت یہ چاہتی ہے کہ میرا خاوند میری ہر خواہش کو پورا کرے۔وہ خواہش جذباتی ہو،معاشرتی ہو یا تہذیبی۔مرد اور عورت کی نفسیات اور خواہشات میں بہت فرق ہوتا ہے۔شادی کا رشتہ ایک مذہبی اور معاشرتی بندھن ہے جو دو مختلف ذہنوں،سوچوں اور خیالات کو باہم جوڑ کر رکھتا ہے۔شادی کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ انسان ایک دوسرے کی اطاعت اور تابع فرمانی میں اپنے جذبات اور سوچ کے رُخ کو بدلنے کی کوشش کرے۔شادی کے رشتے کی زرخیزی پُرخلوص اعتماد اور کامل یقین پر دلالت کرتی ہے۔دو لوگوں کے درمیان تیسرا شخص ایسے ہی حائل ہو جاتا ہے جیسے ایک خواہش کے درمیان دوسری خواہش چپکے سے جنم لے لیتی ہے۔میاں بیوی کی باہمی ہم آہنگی شادی کے رشتے کے لیے انتہائی موزوں ہے۔زوجین کے درمیان اگر ذہنی ہم آہنگی میں توازن و اعتدال نہ ہو تو شادی کا پختہ تر بندھن کچے دھاگے کی طرح ٹوٹ کر بکھر جاتا ہے۔

نفرت ایک عادت ہے جسے اختیار کر کے رشتوں کو جھٹلایا تو جا سکتا ہے لیکن ان سے دامن نہیں چھڑایا جا سکتا۔

لاحاصل ہمیشہ لاحاصل کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔لاحاصل کی خواہش حاصل کی تسکین سے محروم کر دیتی ہے۔

بچے کو دودھ پلانے کی بجائے الفاظ پلاؤ،جلدی بڑھا ہوگا۔

مجھے تنہائی سے ڈر نہیں لگتا کیونکہ تنہائی میرے باطن میں سانس بن کر متحرک رہتی ہے۔

خیالات بہلاوے سے زیادہ کچھ نہیں ہوتے۔

اُولاد جوان ہو جائے تو انھیں کھانے اور پہنانے کی ضرورت نہیں اہم نہیں رہتی بلکہ پیار اور توجہ کی ضرورت ہوتی ہے لیکن اکثر والدین کا رویہ اس سے مختلف ہوتا ہے۔ بچہ بچپن کی عمر تک اتنا دلکش اور پُرکشش ہوتا ہے کہ ہر شخص کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے۔ ہم چاہتے نا چاہتے ہوئے بھی اس کی طرف کھنچے چلے جاتے ہیں لیکن یہی بچہ جب شعور کی وادی میں داخل ہوتا ہے تو سب رشتے، توجہ سے آنکھ چُرا جاتے ہیں۔ رویئوں کے نشتر اس کے حواس میں چبھو کر اسے احساس دلاتے ہیں کہ اب تو ہماری توجہ کے قابل نہیں رہا۔ وہ بچہ بڑا ہو کر ان رشتوں کے تقدس اور کبریائی کا معترف تو رہتا ہے لیکن سوچ اس کی باغی خیالات کی راہ ہموار کرنا شروع کر دیتی ہے، پھر دیکھتے ہی دیکھتے پرندوں سے بھرا ہوا گھونسلا پل بھر میں خالی ہو جاتا ہے۔ اس بارونق پنجرے کو خالی کرنے کا سبب کون بنتا ہے؟ خود ہم یا پھر کوئی اور؟

عورت کی آنکھوں اور ہونٹوں کے درمیان صدیوں کے فاصلے حائل ہوتے ہیں جنھیں پاٹنے میں کبھی لمحہ تو کبھی صدیاں بیت جاتی ہیں۔

وقت نہ گزرتا ہے، نہ ٹھہرتا ہے، نہ آتا ہے، نہ جاتا ہے، وقت سانس کی حرکت کے ساتھ متحرک رہتا ہے

خوبصورتی اگر جسم کی نمائش سے ممکن ہے تو میں برہنہ رہ کر زیادہ حسین دکھائی دیتا ہوں۔

بچے کورے کاغذ کی طرح ہوتے ہیں، بچپن میں انھیں بچپن کا تو بنایا جا سکتا ہے لیکن بچپن میں بچپن جیسا نہیں۔

چاند میں اگر سو داغ بھی ہوں تو بے داغ ہی رہتا ہے، چمکتا ہے، روشنی دیتا ہے، دل لبھاتا ہے، پُرکشش رہتا ہے، چاہے جانے کی تمنا بھی ہوتی ہے اور چاہا بھی جاتا ہے۔ اس چاند میں داغ ڈھونڈنے والے داغ ڈھونڈتے رہتے ہیں لیکن چاند ہمیشہ بے داغ ہی رہتا ہے۔

عشق صرف خدا سے کیا جا سکتا ہے کیونکہ اسے اپنی بے نیازی پر ناز ہے محبت انسان سے کی جا سکتی ہے کیونکہ اُسے اپنی انا پہ گھمنڈ ہے، گھمنڈ توڑنے میں راحت ملتی ہے اور بے نیازی کے آگے سرنگوں ہونے سے قلبی اطمینان نصیب ہوتا ہے۔

جاہل اور پست ذہن کا حامل شخص ماحول کی تربیت اور پرورش سے بھی مہذب نہیں بن سکتا۔ عمدہ پوشاک زیب تن کر لینے سے فطرت نہیں بدل سکتی، عادتیں بدل جانا تو معمولی بات ہے۔

مدرسے، سکول اور تعلیمی ادارے ایک مہذب اور باشعور انسان بنانے میں ناکام رہ جاتے ہیں جبکہ ریوڑ ہانکنے والا معراج کی منزل تک رسائی حاصل کر لیتا ہے۔ کیوں؟ سوچیں!!!!!!

کسی رشتے کی استقامت کا انحصار اس کی یکتائی کے احساس سے ملتزم ہے۔

قلی بن کر زندگی گزرنے سے بہتر ہے، ڈاکو بن کر لوگوں کو لوٹا جائے، مساوات کا یہی تقاضا ہے۔

متغیر اور قابل تقلید شخصیت کی تعمیر کے لیے عمدہ شعور اور ادارک کی ضرورت ہوتی ہے۔

بچپن ایک کٹی ہوئی پتنگ کی طرح ہوتا ہے جس کی مکرر خواہش زندگی کی شمع گل ہونے تک برقرار رہتی ہے۔

آوارگی ایک ایسا مہمل ہتھیار ہے جس سے دُنیاوی ذمہ داریوں سے چھٹکارا تو مل جاتا ہے لیکن طمانت سے روح محروم رہتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کسی قوم پر اس وقت تک عذاب نازل نہیں کرتا جب تک اس قوم میں موجود ایک بندہ اللہ کا نام لینے والا نہ رہ جائے۔ پاکستان میں اللہ کا نام لینے والے، اس ملک کو اللہ کے نام پر حاصل کرنے والے، اللہ کے نام پر مانگنے اور خیرات دینے والے ابھی کوڑیوں بھرے پڑے ہیں۔

اللہ کو ہم نے ایک موزوں ہتھیار سمجھ رکھا ہے جسے ضرورت کے تحت جہاں چاہے بے دھڑک استعمال کرتے ہیں۔ یاد رکھو! اللہ جب مخلوق کو کھلونا سمجھ کر کِک کرتا ہے تو صدیوں تک اس کی قہاری و جباری کے اثرات عبرت بن کر یہ احساس دلاتے رہتے ہیں کہ خدا کو زبان سے خالق تسلیم کرنے سے خالق اپنی مخلوق کو تسلیم نہیں کرتا۔ اللہ سے مذاق اور کھیل ختم کریں اور اس سے معافی مانگیں۔ اسے اپنا مالک، رازق اور خالق سمجھ کر یقینِ محکم کی دولت سے خود کو مطمئن کریں وگرنہ بربادی اور ذِلت بہت جلد اس قوم کے ساتھ اس کے باسیوں کا مقدر بننے والی ہے۔

میں کچھ نہیں جانتا، بس اتنا جانتا ہوں کہ میں کسی کی امانت ہوں اور وہ میرا منتظر ہے۔

محبت دھان کے کھیت کی طرح ہوتی ہے جو بھروسے کی پھوار سے تر تو رہ سکتا ہے، بدگمانی کے پانی سے بار آور نہیں ہوسکتا۔

جانوروں کی کچھ عادتیں انسانوں کے رویئے کی غماز ہوتی ہیں لیکن جانور کبھی انسانوں کی نفسیات کے قائل نہیں ہوتے وہ انسانوں کو اپنی عادت کا حصہ بنا لیتے ہیں

کچھ باتیں، کچھ الفاظ، کچھ سوچیں، کچھ جذبات۔ کچھ عادتیں، کچھ تجربے، بلا کچھ کہے، سوچے، سمجھے اور گویا ہوئے زندگی کے ساتھ ہم سفر رہتے ہیں۔

آنے والا ہر دن امروز ہوتا ہے جو آپ کے ساتھ وقت گزار کر چلا جاتا ہے لیکن ہم اسے فردا کے ساتھ منسلک کر کے اس کی صحبت اور فیض سے مکرر لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں۔

دُنیا میں انسان ایک مسافر ہے لیکن یہ مسافر خود کو اس دھرتی کا مستقل رہائشی سمجھ کر عدم کے سفر کی تیاری سے غافل رہتا ہے۔

ملک ایک خاندان کی طرح ہوتا ہے جس میں ایک شخص کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ باقی افراد پر اپنی منطق کے مطابق اُصول وقوانین لاگو کرے۔ان اُصول وقوانین کی پابندی باقی افراد پر لاگو ہوتی ہے جسے اہل خانہ فرض سمجھ کر ادا کرتے ہیں۔ پاکستان کو اسلام کے نام پر حاصل کرنے کے بعد ہم نے اسے جمہوری نظام کے تابع کر دیا اور گھر کے تمام افراد کو یہ حق دے دیا کہ وہ جسے چاہے اپنا پیشوا تسلیم کر لیں اور چاہیں تو خود بھی اس پیشوائی کا دعوی کر لیں۔ جمہوریت کے نام پر یہ وہ اختیار ہے جس نے اس ملک کے ہر گھر میں کئی پیشوا اور رہنما پیدا کر دیے ہیں جو اس ملک کی بربادی اور تباہی میں اپنی منطق کا بے حجابانہ استعمال کرتے چلے آرہے ہیں۔اس روش نے ملک کی جڑیں کھوکھلی کر دی ہیں ۔یہ تناور درخت سوکھ کر ایک ٹُنڈ کی شکل اختیار کر گیا ہے،جس کے ہرا ہونے کی اُمید کسی سمت سے دکھائی نہیں دیتی۔بس ایک حل ہے اور وہ یہ کہ اس ملک کی ترقی کا انحصار صرف خدا سے معافی اور استغفار پر آکے ٹھہرا ہے۔جب تک پوری قوم خدا سے معافی نہیں مانگ کر معاملاتِ زندگی میں اعتدال اور توازن قائم نہیں کرے گی تب تک اس ملک کا نظام اپنی درست حالت میں کام نہیں کرے گا۔

بعض دفعہ آنکھوں سے دیکھا اور کانوں سے سنا اتنا ہی سچا ہوتا ہے جتنی شدت سے ہم اسے جھٹلا دیتے ہیں۔

ہم ایک رشتے کے ساتھ ایک اضافی رشتہ ضرور بناتے ہیں تا کہ ایک کے چھوٹنے سے دوسرا سہارا بنا رہے، یہ منافقت ہے جو ہمیں کاہل اور بودا بنائے رکھتی ہے۔

جو کچھ بولنا ہے بول دیجئے، جو کچھ لکھنا ہے، لکھ دیجئے، جو کہنا ہے، کہہ دیجئے، کیونکہ آپ وہی بولیں گے جو زباں کی نوک پہ معلق ہے، آپ وہی لکھیں گے جو ذہن کی لوح پہ نقش ہے، آپ وہی کہیں گے جو کہنے سے قبل سوچ چکے۔

حقیقت یہ ہے کہ جو شخص جتنا ظلم برداشت کرتا ہے اتنا ہی اپنے ماتحت پر کرتا ہے۔اگر لوگ صرف ظلم برداشت کرنا شروع کر دیں اور کرنا چھوڑ دیں تو ظلم اپنی موت آپ مر جائے گا۔

عورت کا سب سے بڑا مسئلہ اور خوش فہمی یہ ہوتی ہے کہ وہ مرد کو بہت بہادر سمجھتی ہے۔اُس وقت بھی جب وہ ریت کی دیوار کی طرح بکھر رہا ہوتا ہے۔مرد ہو یا عورت کوئی بھی زندگی کے ہر معاملے اور لمحے میں بہادر نہیں رہ سکتا۔بہت سے واقعات، بہت سی باتیں اور حالات انسان کو کمزور کر دیتے ہیں،اس کمزوری اور مایوسی کے عالم میں ہمدردی کے دو بول بولنے والا بہت قریب ہو جاتا ہے اور اپنا سا لگنے لگتا ہے جس سے زندگی کا دُکھ سکھ بانٹنے میں دلی راحت سی محسوس ہونے لگتی ہے۔دلوں میں حائل فاصلے ختم ہونے لگتے ہیں اور حالات بھی کروٹ بدل کر ایک نئی اور خوش کن صورت میں نمودار ہونے لگتے ہیں جس سے زندگی میں بہار آجاتی ہے۔انسان چاہے جتنا بھی بہادر اور قوی کیوں نہ ہو اسے ایک ہمدرد اور ملنسار کی ضرورت ہمیشہ رہتی ہے۔

انسان جتنا مجبور ہے اتنا با اختیار بھی ہے۔فرق بس اتنا ہے کہ بعض لوگ خود کو بے بسی کی قید میں مقید کر لیتے ہیں اور بعض لوگ اختیار کے دائرے میں وسعت پیدا کر کے اعتدال کا راستہ پیدا کر لیتے ہیں۔

بعض سراب زندگی کو نخلستان بنانے کے لیے ضروری ہوتے ہیں جن کا تسلسل سے پیچھا کرتے رہنے سے سراب نخلستان بن جاتا ہے۔زندگی بھی ایک سراب کی طرح ہے جس کا صبر اور ہمت سے مقابلہ کرنے سے زندگی کی گہری کھائیوں اور خطرناک موڑوں سے گزر کر گلستان کی وادی میں قدم رکھا جا سکتا ہے جہاں شادمانی اور سکون کی فضا رشتوں کے اشجار کو آکسیجن فراہم کرتی رہتی ہے۔

محبت کرنے کے لیے ایک عورت کو مرد کی اتنی ضرورت نہیں ہوتی جتنی محبت کے رشتے کو بدگمانی سے بچانے کی فکر لاحق ہوتی ہے۔

اچھا دوست ایک اچھا دشمن تو بن سکتا ہے لیکن اچھا دشمن کبھی اچھا دوست نہیں بن سکتا۔

اگر میں چاہوں تو سب کچھ ممکن ہے، اگر میں ارادہ کر لوں تو موت بھی مجھ سے خوف کھائے۔

بعض باتیں صرف پچھتاوے کا سبب ہوتی ہیں۔

دو کاموں میں سے، دو باتوں میں سے، دو رشتوں میں سے، دو دوستوں میں سے، دو فیصلوں میں سے، کسی ایک کا انتخاب کرنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا زبان سے پھسلے ہوئے لفظوں کو ہوا کے لامحدود خلا سے ڈھونڈ نکالنا۔

قدرت نے ہمیں جس جگہ، جس مقام، جس حالت میں رکھا ہے یہ ہمارے لیے بہت بہتر ہے۔ اگر آپ اس تقسیم سے مطمئن ہیں تو زندگی بہت سہل اور راحت فزا محسوس ہوگی۔

اُولاد کی کچھ خواہشیں ادھوری رکھیں۔ انھیں تھوڑا دُکھ دیتے رہیں۔ تھوڑا بے رُخ رہیں۔ تھوڑا غصہ دکھائیں۔ تھوڑا سخت مزاج رہیں۔ اُولاد پھول کی طرح ہوتی ہے۔ اگر آپ انھیں جذباتی و عقلی حوالے سے پختہ نہیں کریں گے تو اور کون کرے گا؟؟؟

وقت کی تلوار کا دھارا نوکیلا ہوتا ہے، تیز نہیں ہوتا۔ یہ کاٹتی نہیں ہے بس خراشیں ڈال دیتی ہے، جس سے خون نہیں بہتا، بس ہلکا سا درد رہتا ہے۔ وقت مرہم بن کر ان زخموں کو مندمل نہیں کرتا۔ زخم خود اپنی طبعی عمر کو پہنچ کر مندمل ہو جاتے ہیں۔

ڈرے ہوئے انسان کو مزید ڈرانے سے بہتر ہے اسے مار دیا جائے کیونکہ اگر وہ زندہ رہے گا تو یہ ڈر اس کی اگلی نسلوں تک منتقل ہو جائے گا۔

لوگوں سے مانگو گے تو خدا بھی دے گا۔ خدا سے مانگنے والے لوگوں کی خیرات سے محروم رہ جاتے ہیں۔

دُنیا میں سب سے مشکل کام اپنی ذات کو تمام ترعیبوں کے ساتھ قبول کرنا ہے۔

جس کام یا پیشے میں لذت نہ رہے، اس سے حاصل ہونے والی روزی میں برکت نہیں رہتی۔

کامیابی کا واحد راستہ ایمانداری ہے اور ایمانداری سے کام کرنا دُنیا کا مشکل ترین کام ہے۔

تالاب میں چھلانگ لگا کر، تلاب میں ڈوبکی نہیں لگائی جا سکتی۔

باغی اور خودسر انسان کے سب سے بڑے اور بدرجہ اول دُشمن اس کے والدین ہوتے ہیں۔اس کے بعد اس کے بہن بھائی ہوتے ہیں۔ تیسرے درجے پر نھیال، دُدھیال اور شریکا ہوتا ہے۔چوتھے درجے پر برادری، رسم و رواج اور قدامت پسندی ہوتی ہے۔پانچویں درجے پر لوگ، زمانہ اور حالات ہوتے ہیں۔ان سب درجوں کی تابع فرمانی ایک انسان سے ممکن نہیں ہوتی۔کہیں نہ کہیں وہ اس بھنور میں اُلجھ جاتا ہے اور پھر اس کی اپنی انفرادیت ختم ہو جاتی ہے۔ زندگی کے سب خواب، مقاصد اور خواہشیں ایک ایک کر کے کسی نہ کسی مجبوری اور پابندی کے ہاتھوں اپنا گلہ خود گھونٹ کر موت کی وادی میں اُترتی رہتی ہیں۔زندگی مختصر اور خوبصورت ہے لیکن انسان انھیں درجات کے پھیر میں چکر کھا کر روز جینے اور مرنے کا ناٹک کرتا رہتا ہے۔یہ دُنیاوی درجات انسان کی انفرادی اور منفرد سوچ کو کبھی پنپنے کا موقع نہیں دیتے۔ اس سے فرار کسی صورت ممکن نہیں ہے۔یہی دُنیا ہے یہی دُینا داری کا تقاضا ہے۔

جسم کی تراش خراش میں اکثر روح کی تعمیر کے لوازم نظر انداز ہو جاتے ہیں۔

خوش قسمتی کا انحصار مال و دولت یا شہرت و عزت پر نہیں ہوتا۔اپنی ذات کی اچھی بری جبلّت کو فطرتاً قبول کرنے سے ہوتا ہے۔

محبت ہونا بہت ضروری ہے، یہ انسان کی ذہنی و جذباتی تعمیر میں ماں کی طرح اہم کردار ادا کرتی ہے۔

بدقسمتی سے بڑھ کر اگر کوئی محرومی ہے تو وہ احساس کی محرومی ہے۔

زندگی میں اکثر ایسے موڑ آتے ہیں جہاں آ کر انسان سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ اب کیا سوچا جائے؟؟؟

شادی کے بعد بیوی شوہر کے ہاتھ میں پکڑے ترازو کے جس پلڑے میں جا کر بیٹھتی ہے وہ پلڑا بہت ہلکا ہوتا ہے۔ دوسرے پلڑے میں سُسرال والے ہوتے ہیں وہ پلڑا بہت بھاری ہوتا ہے اور کئی برسوں تک بھاری ہی رہتا ہے پھر آہستہ آہستہ صبر، قربانی اور برداشت سے بیوی کا پلڑا بھاری ہونے لگتا ہے، جھکنے لگتا ہے پہلے سُسرال والوں کے پلڑے کے برابر آتا ہے پھر اُس سے بھاری ہو جاتا ہے پھر ہمیشہ بھاری ہی رہتا ہے فضا میں معلق نہیں رہتا، وہ زمین سے لگا رہتا ہے لیکن توازن بدلتا ہے۔ یہ کام صرف اور صرف عورت کا صبر کرتا ہے، وقت کرتا ہے، قربانی کرتی ہے۔

دُنیا میں اچھے آدمی کوڑیوں بھرے پڑے ہیں لیکن بُرے آدمی خال خال نظر آتے ہیں۔ کوئی شخص خود کو برا نہیں کہتا۔ جو خود کو سچا کہے اُس سے دامن چھڑا لو۔ جو خود کو جھوٹا کہے، اس کا قُرب حاصل کرو۔ یہی بظاہر جھوٹا آدمی در حقیقت سچا ہوتا ہے۔

اُس شخص کی قدر کیسے کی جا سکتی ہے جس نے اپنے فائدے کے لیے معاشرتی قدروں کو پامال کر دیا۔

کسی شخص کو سچا اور جھوٹا ثابت کرنا دُنیا کا مشکل ترین کام ہے لیکن ہم یہ کام لمحوں میں کر گزرتے ہیں۔

انسان زندگی کے ہر میدان میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ کبھی کبھی ناکام ہونا بھی کامیابی کے تسلسل کی علامت ہوتا ہے۔

دُنیا میں ایک ہی شخص ہے جو آپ کو اور آپ کی زندگی کو بدل سکتا ہے، وہ شخص آپ خود ہیں۔

لوگوں کو آزمانے کی بجائے خود کسی کی آزمائش بن جاؤ۔ زندگی کے اصل مقصد سے آشنا ہو جاؤ گے۔

کچھ لوگ بہت اذیت دیتے ہیں۔ان لوگوں میں اکثر اپنے ہوتے ہیں۔جس تکلیف میں ہم مبتلا ہوتے ہیں اس کا احساس تکلیف دینے والوں کے احساس کے تصور میں کبھی نمودار نہیں ہوتا۔اب ایسے لوگوں کے رویوں پر کوئی ردِعمل اختیار کیا جائے تو مزید تکلیف کا احساس ہوتا ہے۔عجیب بات ہے کہ ان لوگوں کو کوئی ایسی بد دعا بھی نہیں دی جا سکتی جو ان کے ذہنی اُفق پر احساس کا پیرہن اُوڑھ کر ان سے رُوبرو ہو جائے۔ میں اکثر حیران ہوتا ہوں ایسے رشتوں پر جنھیں کوئی بد دعا یا تکلیف دینا انسان کے بس میں نہیں ہوتا۔

زندگی میں درد کا ہونا بہت ضروری ہے۔اس کی شدت روگ بن کر روح کو ڈستی رہتی ہے لیکن جب اس کی شدت کم ہوتی ہے تو لذت بھی ملتی ہے،ایک ایسی لذت جس کی تفہیم لفظوں سے ماورا ہوتی ہے۔یہ کسک جو ہوتی ہے نا! یہی اصل دولت ہے جو انسان کو شعور اور آگہی عطا کرتی ہے۔یہ ایک تازیانے کا کردار ادا کرتی ہے جس کی مدھم لے روح کی بے قراری کو تسکین میں بدل دیتی ہے۔

عشق کے بغیر زندگی کا تصور ممکن نہیں۔مجھے ہمیشہ عشق کے بلند و بالا پہاڑ کو سر کرنے کی خواہش بیقرار رکھتی ہے لیکن کوئی مدِ مقابل میسر نہیں آتا۔

پیار کی شادی ایک اجنبی شخص کی طرح ہوتی ہے جو پہلی نظر میں حسین اور خوبصورت نظر آتا ہے مگر اس کا قُرب اضطراب اور پچھتاوے کا ڈنک بن کر روح کی حساسیت کو ڈستا رہتا ہے اور انسان اس کرب سے ایک مدت تک خود کو نکالنے سے ناکام کوشش کرتا رہتا ہے۔

کسی کو اپنے سامنے جُھکانے سے بہتر ہے کسی کے آگے اس قدر جھک جاؤ کہ وہ آپ کے ظرف اور بڑے پن کے آگے سرنگوں ہو جائے۔

کچھ رشتے دو ہونٹوں کے درمیان محفوظ ہونے کے باوجود غیر محفوظ رہتے ہیں۔

انسان کو مارنے سے بہتر ہے اسے کسی ذہنی اذیت میں مبتلا کر دیا جائے، خود ہی گھٹ گھٹ کر مر جائے گا۔

عورت کے کئی روپ، رنگ، انداز اور حقیقتیں ہوتی ہیں مگر ہم اسے ماں، بہن، بیٹی اور بیوی کے رشتے سے جوڑ کر اسے انسانیت کے اعلیٰ ترین درجے پر فائض کر دیتے ہیں لیکن کیا عورت اس درجے سے مطمئن ہوتی ہے جو ہم اسے عطا کرتے ہیں ؟؟؟اگر مطمئن ہے تو ساس، بہو، سوکن، طوائف، کنجری، فاحشہ، حرافہ کے روپ میں ڈھلنے والی ذات کون ہے۔؟ یہ بھی عورت ہے یا ماسوا عورت ؟؟؟؟

اسلام نے اُولاد کی تربیت کا ذمہ دار عورت کو نہیں بلکہ مرد کو قرار دیا ہے لیکن مرد نے ہمیشہ اس ذمہ داری کو قبول کرنے سے انکار کیا ہے جس کا نتیجہ اُولاد با کردار اور مہذب شہری بننے کی بجائے چور، ڈاکو اور معاشرے کے وہ گندے کیڑے بنتے ہیں جن کے افعال ایسے بھیانک اور المناک واقعات پر مبنی ہوتے ہیں جس سے انسانیت کا سر خدا کے روبرو شرمندگی سے جھک جاتا ہے۔

پچھتاوا ایک ایسا احساسِ زیاں ہے جو گھن کی طرح انسان کے ضمیر کی لطافت اور رُوح کی حسایت کو چاٹ جاتا ہے لیکن آسودگی اور طمانت کا احساس پھر بھی نصیب نہیں ہوتا۔

خدا کی تفہیم انسان کے ادراک سے بہت ماورا ہے۔ خدا کو تسلیم کرنے کے سوا، ماسوا کچھ نہیں۔

دو جھوٹے لوگوں میں سے کسی ایک کو سچا کہنا اُتنا ہی مشکل ہے جتنا دو سچے لوگوں میں سے کسی ایک کو جھوٹا کہنا۔

کسی کے لیے مرنے سے بہتر ہے اس کے لیے جیا جائے۔ ہو سکتا ہے آپ کے جینے سے وہ جی اُٹھے۔

کسی شخص پر بھروسہ کرنے کا مطلب اپنی ذات پر یقین کا اُٹھ جانا ہے۔

کسی شخص یا مقصد کے لیے اپنی وراثتی جبلّت کو بدلنے کی کوشش کرنا اتنا ہی مشکل ہے جیسے ساحل کے دامن سے خشک ریت ڈھونڈنا۔

ماں باپ کی بھی خواہشیں اُولاد پورا نہیں کرسکتی۔ اسی طرح اُولاد کو سمجھ لینا چاہیے کہ والدین بھی اُولاد کے سب خوابوں کی تعبیر نہیں کرسکتے۔

محبت اور انا میں کسی ایک کا انتخاب کرنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا کمان سے نکلے ہوئے تیر کا واپس آنا۔

محبت اور انا کے درمیان اگر اعتماد کا رشتہ قائم رہے تو محبت انا کو سرنگوں ہونے پر مجبور کر دیتی ہے۔

خواب دن سے سویرے میں دیکھنے چاہیے اور ان کی تکمیل رات کی تاریکی میں ڈھونڈنی چاہیے۔

اُولاد اس لیے عزیز ہوتی ہے کیونکہ انھیں ہم نے جنم دیا ہوتا ہے۔ رشتے اس لیے عزیز ہوتے ہیں کیونکہ یہ ہماری ذات اور حیات کا حوالہ ہوتے ہیں لیکن ہمارے اردگرد بسے ہوئے، چلتے پھرتے، ملتے، بچھڑتے انسان جنھیں ہم [لوگ] کہہ کر نظر انداز کر دیتے ہیں، یہ ہمارے نہیں ہوتے یا ہم ان کے نہیں ہوتے یا ہم کسی کے بھی نہیں ہوتے یا پھر ہم خود کے نہیں ہوتے۔ کون کس کا ہے، کون کس کے قریب ہے، کون کس کے لیے مرتا ہے، جیتا ہے، سانس لیتا ہے، جان دیتا ہے، لیتا ہے، مرتا ہے، مار دیتا ہے۔ یہ انسان ہوتے ہیں یا لوگ ہوتے ہیں یا پھر جذبے ہوتے ہیں یا پھر احساس ہوتا ہے، پاس ہوتا ہے، لحاظ ہوتا ہے، خیال ہوتا ہے، کیا ہوتا ہے، رشتے، انسان، خیال، احساس یا پھر لوگ، اپنے پرائے، اجنبی کون کیا کیوں کس لیے؟؟؟؟؟؟؟؟؟ سوچیں!!!!!!

کسی کو غلام بنانے کی بجائے اگر اسے آزاد چھوڑ دیا جائے تو وہ شخص زیادہ تابع فرمان اور اطاعت گزار ثابت ہوگا۔

زندگی ایک لمحہ ہے، جس کی محدود وسعت میں لامحدود خواہشیں پنپتی رہتی ہے، تکمیل کو نہیں پہنچ پاتی۔

زندگی اور موت کے درمیان ہمارا ہونا اسی طرح ہے جیسے صبح و شام کے درمیان آفتاب کا طلوع و غروب ہونا۔

کسی عمل پر نادم ہونا اتنا ہی مشکل ہے جتنا کسی دوسرے کے نادم ہونے کو تسلیم کرنا۔

جاہل اور ان پڑھ عورت سے شادی کرنے سے بہتر خودکشی کرنا ہے۔

اُولاد کوئی جائداد نہیں ہے جسے والدین اپنی ضرورت کے تحت جہاں چاہیں استعمال کریں، اُولاد ایک ذمہ داری ہے۔ ایک فرض ہے، جس کے اچھے اور برے مستقبل کا انحصار محض پرورش پر نہیں بلکہ اچھی تربیت پر منحصر ہے۔

عورت اُولاد کو جنم دینے کے بعد اس کی پرورش کرتی ہے لیکن تربیت کا اہم ترین عمل خود کرنے کی بجائے مذہبی مدرسوں، تعلیمی اداروں اور معاشرے پر چھوڑ دیتی ہے جو اسے ایک مہذب اور شائستہ انسان بنانے کی بجائے سماج کا گندہ کیڑا بنانے میں معمولی اور بعض اُوقات اہم ترین کردار ادا کرتے ہیں۔

انسان دُنیا میں مسافر نہیں ہے بلکہ دُنیا کے وجود اور اس کی رونق کا اہم ترین حصہ ہے۔ مسافر تو وہ ہوتا ہے جو کسی تلاش میں رہتا ہے۔ انسان کسی تلاش کا حصہ نہیں بلکہ خود ایک تلاش ہے جس کا سفر اپنی ذات کی تلاش پر آ کے ختم ہوتا ہے۔

کسی شخص کی کامیابی اور خوشحالی کا انحصار باشعور اور تعلیم یافتہ ماں پر منحصر ہے۔

انا کے سائے میں پلنے والی خواہشیں کبھی تکمیل کا در وا نہیں کرتیں۔

اپنے آپ کو جھوٹا تسلیم کرنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا کسی دوسرے کو سچا ماننا۔

محبت مزاج کا نام ہے جس کا امتزاج ہمارے معیار کے اختلاف پر منحصر ہے۔

زندگی میں اگر کسی تلاش کو اپنا ماحصل سمجھ لیا جائے تو زندگی کے اصل حقائق تک رسائی ممکن ہو جاتی ہے۔

تارکِ دُنیا ہونے سے زندگی اپنا رُخ نہیں بدلتی بلکہ یہ بے مہار گھوڑے کی طرح محوِ سفر رہتی ہے

فقیر بن کر جینے سے بہتر ہے ذلیل بن کر جی لیا جائے، انسانیت سے کٹ کر انسانی قدروں کو شکست نہیں دی جا سکتی۔

جس گناہ کو کرنے پر آپ مجبور ہو جائیں پھر وہ گناہ، گناہ نہیں رہتا عادت بن جاتی ہے۔ عادت پختہ ہو جائے تو عمر بھر ساتھ نہیں چھوڑتی۔

ہم دُنیا کو اپنے معیار اور خواہش کے مطابق ڈھالنا چاہتے ہیں لیکن دُنیا ہمیں اپنے جیسا بنا کر دم لیتی ہے۔

شہر کے باسی اپنے ہمسائے سے اتنے ہی لاتعلق ہوتے ہیں جتنا ہم اپنے آپ سے بے خبر ہوتے ہیں۔

لوگ دُنیا کو فانی سمجھ کر اس میں بقا تلاش کرتے رہتے ہیں۔

باپ کی مسلسل غیر موجودگی اور عدم توجہی گھر کے ماحول اور اُولاد کے ذہنی سوچ میں محرومیوں کا ایسا زہر گھول دیتی ہے جس کی کسک عمر بھر روح کے احساس کو کُریدتی رہتی ہیں۔ بدن کی ٹیسیں انسان کی سوچ کو برہنہ کر دیتی ہیں جس کے زخموں پر ہمدردی کے پھاہے بھی تسکین کی لذت سے بدن کی حسوں کو محروم کر دیتے ہیں۔

دُنیا کی حسین اور خوبصورت ترین لڑکیوں میں سے کسی ایک لڑکی کا انتخاب کرنا دُنیا کا آسان ترین کام ہے لیکن اس لڑکی کی آزادی اور عزت نفس کو زمانے کی نفرین نظروں، تشکیک آمیز لہجوں اور بدگمانی کے جال سے بچا کر رکھنا دُنیا کا مشکل ترین کام ہے۔

یک طرفہ رُوگ جان کا دُشمن بن جاتا ہے۔ جان کے رُوگ کو دُشمن بنانے کا مطلب اپنی ذات کو خود ساختہ تکلیف میں مبتلا کرنا ہے جو پچھتاوے کی گہری چوٹ اور احساس کی چُبھتی کسک کے سوا کچھ نہیں دیتا۔

مخالف راستوں پر چلنے والے مسافر کبھی جیون ساتھی نہیں بن سکتے، سوچ کے ساتھ سفر کا ہم آہنگ ہونا بہت ضروری ہے۔

محبت کرنا کوئی جرم نہیں لیکن محبت کے نام پر کسی شخص کو گھر کی چار دیواری میں مقید کر دینا کسی ظلم سے کم بھی نہیں۔

پیار کی شدت اگر شک میں بدل جائے تو دلوں کا سکون تباہ کر ڈالتی ہے۔

شادی عورت کا نصیب ہوتی ہے جسے سمجھنے میں اس کی عمر بیت جاتی ہے۔

انسان کی ہر تمنا اور آرزو کسی ایک شخص تک محدود نہیں رہتی بلکہ وقت کی گردش اس کی شدت میں کمی بیشی کرتی رہتی ہے۔

رشتہ اس وقت ختم ہو جاتا ہے جب ذہنی طور پر اس سے فرار کی خواہش بیدار ہو جائے۔

اگر میں کسی کو پسند نہیں تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ میں پسند کے قابل نہیں۔

عورت کو دُنیاوی تعلیم اپنے گھریلو ماحول اور معاشرے کی ضرورت کے مطابق دی جائے، پیشہ ورانہ تعلیم کا حصول ازدواجی زندگی پر خوشگوار اثر ڈالنے کی بجائے مضر رساں ثابت ہوتا ہے۔

بیٹے کی پسند کو ماں کی پسند بننے میں عمر بیت جاتی ہے لیکن ماں کی پسند کو بیٹے کی پسند بننے میں فقط ایک سمجھوتہ درکار ہوتا ہے جو میاں بیوی کے درمیان شادی کے بندھن سے معلق ہوا کے دوش پہ رکھے ہوئے چراغ کی مانند جلتا، بجھتا محوِ آزمائش رہتا ہے۔

کسی کو جان لینے کا مطلب اس کی حقیقت سے واقف ہونا نہیں ہوتا۔ جسے جان لیتے ہیں وہ یاد رہتا ہے اور جو یاد کا حصہ بن جاتا ہے وہی اصل رشتہ ہوتا ہے جسے محبت کے بندھن میں باندھ کر زندگی گزاری جا سکتی ہے۔

گزرتے وقت کا ہر پل اگر کسی رشتے میں خوف کا احساس دلائے تو وہ رشتہ برقرار نہیں رہتا بلکہ وقت کی رفتار اسے کچے دھاگے کی طرح توڑ ڈالتی ہے۔

لوگ کہتے ہیں احسان محبت میں کیا جاتا ہے، لیکن میں کہتا ہوں اگر محبت میں شدت ہو تو احسان کا احساس کبھی ذہنوں میں جنم ہی نہیں لیتا۔

دو لوگوں کے درمیان بے تکلفی سے بات کرنا ان کے مابین مظبوط رشتے کی دلیل نہیں ہوتی۔ بعض اوقات آنکھوں کا دیکھا اور کانوں کا سنا جھوٹ بھی ہوتا ہے۔

سو اچھائیوں کے حامل شخص کو شک کرنے کی ایک برائی کے ساتھ قبول کر لینا اپنی ذات کے ساتھ ظلم کرنے کے مترادف ہے۔

مرد میں شک کی بہت بُری عادت ہوتی ہے ایک دفعہ کسی مرد اس عادت میں اُتر جائے تو ہر چیز کو شک کی نظر سے دیکھے بغیر اسے سکون نہیں ملتا۔

زندگی کی تلخیوں کا مقابلہ کرنے کا حوصلہ رکھنے والے لوگ اپنی منتخب کردہ منزل تک رسائی حاصل کر لیتے ہیں۔خرگوش بننے کی بجائے کچھوا بن کر منزل کی طرف یقین کے ساتھ بڑھتے رہنے سے انسان کے قدم منزل تک ایک دن پہنچ جاتے ہیں۔ پتھر کی سِل پر پانی کا قطرہ تسلسل کے ساتھ گر کر اس کے سینے میں شگاف کر سکتا ہے تو انسان عزم، حوصلہ اور وقت کا درست استعمال کر کے اپنی منزل کو بھی چھو سکتا ہے۔

رات کے اندھیرے میں بیوی کے پاؤں چومنے والا دن کے اُجالے میں اس کے وجود سے انکار کرتا ہے اور پھر لوگوں کے سامنے مرد ہونے کا دعوی کرتا ہے ایسی مردانگی پر لعنت ہے، جسے رشتوں کے بکھرنے اور بچھڑنے کا احساس نہیں رہتا۔

جس شخص سے محبت کی جائے اس کی پروا بھی کی جائے، چپ رہ کر جذبات کا اظہار نہ کرنا شک میں مبتلا کر دیتا ہے جو دلوں کے بیچ پنپنے والے رشتے کی جڑوں کو بدگمانی کی تپش سے جھلسا دیتا ہے۔

نصیب میں نیت کا فتور شامل ہو جائے تو نصیب ایک دُھوکا بن جاتا ہے جسے شک گھن کی طرح چاٹ جاتا ہے۔

محبت کرنے والے کے ساتھ اس کے سائے کو برداشت نہ کرنے والے دل کی گہرائیوں میں شک کو چھپا کر نہیں رکھتے۔

خاندانی رشتے کبھی کبھی انسان کو اس قدر اُلجھا دیتے ہیں کہ ان کے جال سے خود کو آزاد کرانا مشکل ہو جاتا ہے۔

جلد بازی میں کیے گئے فیصلے پچھتاوا بن کر انسان کو عمر بھر رُلاتے رہتے ہیں۔

جن لڑکیوں کو اپنے والدین کی عزت کا پاس ہوتا ہے وہ اپنے دل پر پہرہ بٹھا لیتی ہیں پھر وہ انجانے اور دُھندلے خوابوں کی تعبیر میں محوِ سرگرداں نہیں ہوتیں بلکہ بیٹی کے انمول رشتے کا پاس کرنے کے لیے ہر وہ فیصلہ قبول کر لیتی ہیں جو ان کے والدین کرتے ہیں۔ کبھی آہِ سرد نہیں بھرتیں بلکہ خوش و خرم زندگی کے تمام دُکھوں پر سمجھوتے کا پھاہا رکھ کر زندگی بسر کر دیتی ہیں۔ ایسی لڑکیاں اللہ کی نعمت ہوتی ہیں جس کی عزت والدین کے سر کی پگڑی اور انا کا غرور ہوتی ہے۔

بھنورا تازہ پھولوں کا رس چوسنے کے بعد پھر کسی تازہ پھول کی طرف اُڑ جاتا ہے۔ مرجھائے ہوئے پھول پر بیٹھنا اس کی فطرت میں نہیں ہوتا۔ مرد اور بھنورے میں اتنا ہی فرق ہے کہ مرد حالات سے سمجھوتہ کر کے مرجھائے ہوئے پھولوں سے آسودگی کا سامان مہیا کر لیتا ہے لیکن بھنورا تازہ پھولوں کو ڈھونڈنے میں جان سے گزر جاتا ہے۔

سچ گم ہو جائے تو ڈھونڈنے سے نہیں ملتا، پچھتاوے کا احساس انسان کی جان لے لیتا ہے۔

اپنے آپ سے زیادہ کسی دوسرے پر یقین کر لینا بعض اوقات کسی بڑے حادثے کا سبب بن جاتا ہے۔

یک طرفہ محبت میں چاہے کتنی شدت اور تسلسل کیوں نہ ہو، بے رُخی کی ہلکی سی تپش سے جذبات کے دریا سوکھ جاتے ہیں۔

محبت کے اقرار کے سہارے زندگی گزاری تو جا سکتی ہے لیکن ایسے ہی جیسے ہوا کے دوش پہ رکھا ہوا چراغ، جسے جلنے اور بجھنے پر اختیار نہیں رہتا۔

بعض اوقات اُولاد کے خود ساختہ فیصلوں سے والدین اتنے مجبور ہو جاتے ہیں کہ گوشۂ تنہائی تلاش کرنے لگتے ہیں۔

عورت مرد کو قبول کرنے میں، حالات، سمجھوتے اور مجبوری کا زہر پی لیتی ہے لیکن مرد حالات، سمجھوتے اور مجبوری کو اپنی آزادی اور خواہش کی تکمیل کے درمیان دیوار سمجھتا ہے جسے اپنی نفرت اور بے رُخی کے رویے سے پاٹنے کی کوشش تو کرتا ہے لیکن حالات کی گردش اس کی خواہشوں کے آگے ایک مضبوط چٹان بن کر حائل ہو جاتی ہے جسے مرد لاحاصل کوشش کے باوجود پاٹ نہیں سکتا، بالآخر اسے عورت کے وجود کو تسلیم کرنا ہی پڑتا ہے۔

میاں بیوی کے درمیان اُولاد ایک پُل کا کام دیتی ہے، مرد اُولاد کو قربان کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتا، جبکہ عورت محض اُولاد کی خاطر اپنی زندگی کی سب خوشیاں قربان کر دیتی ہے۔ عورت؛ عورت ہو کر خود کو مرد ثابت کر دیتی ہے لیکن مرد، مرد ہو کر اپنی انا کے بھنور میں پھنسا رہتا ہے۔

خوابوں کو تعبیر کیا جا سکتا ہے لیکن کچھ خواب محض بہلاوا ہوتے ہیں جو زندگی بھر کا روگ بن جاتے ہیں اور انسان ان کے سحر سے باہر نہیں نکل پاتا۔

زخم راحت دینے لگے تو ماضی عذاب بن جاتا ہے ہر بار سامنے آ کر ایک نیا زخم دے جاتا ہے، جس سے چھٹکارا دل کا ناسور بن کر روح کو زخماتا رہتا ہے۔

مجبوری انسان کو کبھی کبھی اتنا بے بس کر دیتی ہے کہ انسان جو کچھ کہنا چاہتا ہے وہ کہہ نہیں پاتا اور جو دیکھنا نہیں چاہتا وہ حقیقت بن کر سامنے آ جاتا ہے۔

حالات انسان کو وقت کے آگے جھکنے پر مجبور کر دیتے ہیں لیکن وقت اپنی بے رُخ انا کے ستم رسیدہ رویے سے انسان کو اپنی بے بسی اور لاچارگی پر آنسو بہانے سے بھی محروم کر دیتا ہے۔

عشق میں روح کی پاکیزگی اور یکتائی کا عنصر ہو تو دوسروں کی خوشیوں پر قربان ہو جاتا ہے۔ اگر ہوس ہو تو نفسی خواہش کی تسکین کے لیے خود سے جڑے ہوئے وہ تمام خونی اور خوساختہ رشتے برباد کر دیتا ہے جو اس کی خواہش کی آسودگی کے حصول میں حائل نظر آتے ہیں۔

زمین کی گردش حالات کے بھنور میں وقت کو پیچھے پلٹنے پر مجبور کر دیتی ہے، گزرے ہوئے وقت کو آواز نہ بھی دیں تو وہ ماضی کی صورت سامنے آ ہی جاتا ہے، جسے تسلیم کرنے کا حوصلہ انسان کی ہمت پست کر دیتا ہے۔

کسی شخص کو پالینے کے بعد اس کے ساتھ میانہ روی سے رشتہ برقرار رکھنے سے رشتہ قائم رہتا ہے۔ اپنائیت میں غرور آجائے تو وقت حالات کے آگے مجبور بنا دیتا ہے۔

جب پرندے اپنے گھونسلوں سے اُڑ کر راستہ بھٹک جاتے ہیں تو بستیوں کا سفر کرتے کرتے گھونسلوں تک پہنچ ہی جاتے ہیں۔ حوصلہ اور ہمت ہار دینے سے انسان اپنی منزل کا راستہ کھو دیتا ہے۔

مرد عورت کو بریڈ کی طرح بھوک مٹانے کا ذریعہ سمجھتا ہے لیکن یہ بھول جاتا ہے کہ اس کی جنسی آسودگی کی طمانت کا احساس عورت کے وجود سے نہیں، بلکہ عورت کے وجود کو خلوصِ دل سے قبول کرنے میں ہے۔
جسموں کے وصال سے دلوں کے ملال ختم نہیں ہوتے لیکن دلوں کا وصال جسم کو خواہش سے بے نیاز کر دیتا ہے۔

ماضی میں کیے گئے فیصلے حال کو مضطرب کر دیتے ہیں، جن سے چھٹکارا پانے کے لیے انسان ماضی کے دُھندلکوں میں کھو کر اپنے مستقبل سے منہ موڑ لیتا ہے۔

شوہر کے بغیر عورت دُکان میں رکھی ہوئی کانچ کی گڑیا کی مانند ہے جس پر خریدنے والوں اور گزرنے والوں کی تنقیدی نظریں اس کے وجود کو اندر سے کھوکھلا کر دیتی ہیں۔

میں نے عورتوں کو ہمیشہ مردوں کے قدموں پہ جھکتے ہوئے دیکھا ہے لیکن کبھی کسی مرد کو عورت کے قدموں میں جھکتے ہوئے نہیں دیکھا، خدا نے جنت مرد کے قدموں میں اس لیے نہیں رکھی کیونکہ وہ جھک نہیں سکتا۔

مرد کی فطرت میں بے وفائی، عادت میں ہرجائی، بات کا کچا اور قول کا جھوٹا ہوتا ہے۔ عورت تنہائی سے گھبراتی ہے، کسی سہارے کے بغیر جب جی نہیں پاتی، تو بدنامی کے ڈر سے سہاگ کا آنچل اُوڑھ لیتی ہے۔

اُمید کے ساتھ عزم کی آس باندھ کر سفر کرتے رہنے سے انسان کے قدم ایک دن منزل کو چھو ہی لیتے ہیں۔

عورت بن کر سوچنے سے رشتوں میں ہار ہوتی ہے، بیوی بن کر عورت اگر حالات کا مقابلہ کرے تو جیت اس کی مقدر ٹھہرتی ہے۔

مرد جس سے محبت کرتا ہے اسے حاصل کرنے کے لیے رشتوں کی کہکشاں کو مٹھی بھر خاک میں تول دیتا ہے پھر چاہے زمانہ اسے رُسوا کر کے پچھتاوے کی اندھیر نگری میں لاوارث چھوڑ دے، اسے پروا نہیں رہتی، جبکہ عورت کبھی اپنے دل سے پہلی محبت کے جذبات اور اس سے جڑی ہوئی یادوں کو بھلا نہیں پاتی بلکہ سمجھوتے کے رشتے میں اپنے خواب باندھ کر معاشرے سے ہمدردی سمیٹ لیتی ہے۔ زمانہ اسے دیوی سمجھ کر پوجتا ہے اور یہ دیوی تنہائی میں اپنی گذشتہ محبت کو یاد کر کے آنسو بہاتے عمر گزار دیتی ہے۔

انسان جب بھی دُھوکا کھاتا ہے، بھروسے کی وجہ سے کھاتا ہے۔ کسی پر بھروسہ کرنے سے پہلے اس کی فطرت اور مجبوری کو سمجھنا آنے والی مشکلات اور امتحانات سے بچالیتا ہے۔

انسان کی قسمت میں لکھی ہوئی تقدیر کو بدلنا انسان کے بس میں نہیں ہوتا، کوشش کرنے سے رشتے مضبوط تو ہو سکتے ہیں لیکن بکھر نہیں سکتے۔

محبت میں مان ٹوٹ جائے تو محبت طعنہ بن جاتی ہے۔

اُولاد کی زندگی کا حق استعمال کر کے والدین اپنی نا آسودہ خواہشوں اور رشتوں کی تکمیل میں اکثر اُولاد کی توجہ اور ان کی محبت سے محروم ہو جاتے ہیں۔

والدین کے کچھ فیصلے اُولاد کی زندگی اور سوچ کو بدل دیتے ہیں اور بعض فیصلے ان کی سوچ اور زندگی کو تباہ کر دیتے ہیں۔ فیصلے کی قبولیت کا انحصار وقت کے موزوں ہونے پر دلالت کرتا ہے۔

خوشیوں کی ان گنت گھڑیوں سے محظوظ ہونے کی بجائے انھیں کسی سراب کے پیچھے گنوا دینے سے سوائے پچھتاوے کے اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

زندگی کبھی اپنی فطرت نہیں بدلتی، یہ قدم قدم پر انسان کا امتحان لیتی ہے، اس لیے زندگی کے امتحان کا حوصلے اور صبر کے ساتھ مقابلہ کرنا چاہیے۔

کچھ رشتے ایسے ہوتے ہوں جنھیں وقت سے پہلے نام دینے کی کوشش میں حالات انھیں ہم سے بہت دور کر لے جاتا ہے، پھر ہم انھیں خدا کی رضا، مقدر کا کھیل اور تقدیر کا لکھا سمجھ کر بھول جاتے ہیں لیکن ان کی یاد ہمیں ان سے جوڑے رکھتی ہے۔ یہی یادِ اُمید بن کر اپنی موزوں صورت میں جب جلوہ گر ہوتی ہے تو بچھڑے ہوئے، بکھرے ہوئے رشتے ایک ایک کر کے ایسے باہم مل جاتے ہیں جیسے ستاروں کی کہکشاں اُڑ کر ہمارے آنگن کا چھتنار بن جائے۔

بچیوں کی شادی حالات اور قسمت کی ڈور سے بندھی ہوئی ہوتی ہے۔ ہوا کا رُخ درست سمت میں ہو تو عمر گزرتے ہوئے وقت سمٹ جاتا ہے لیکن مخالف سمت ہوا کا زور ہو تو طوفان ایسے رشتوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے جیسے بگولوں کے بھنور میں اُلجھے ہوئے خس و خاشاک۔

کسی کی کامیابی میں رکاوٹ بننے سے آپ کامیابی کو روک نہیں سکتے بلکہ اُس جذبے کو توانا کر دیتے ہیں جو کامیابی کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔

محبت میں استقامت اور تسلسل نہ ہو تو یہ رشتہ ریت کی دیوار کی طرح اپنے ہی بوجھ سے گر کر خود کو اپنے اندر فنا کر لیتا ہے۔

اندھیرے میں روشنی کا احساس زندگی کے ڈوبتے ہوئے سائے میں اُمید بن کر نظر آتا ہے۔

انسان کو سمجھنے کی بجائے انسان سے محبت کرو، اس کی تفہیم اس کی توجہ اور اپنائیت میں چھپی ہوتی ہے۔

مجھے کوئی بھی بُرا نہیں لگتا کیونکہ میں کسی کو بُری نظر سے نہیں دیکھتا۔

جاہل اور ان پڑھ میں کوئی فرق نہیں لیکن عقل مند اور باشعور میں بہت فرق ہوتا ہے۔

عام انسان اور خاص انسان میں بس اتنا فرق ہے جتنا بکرے اور چھترے میں ہوتا ہے۔

عقل کس طرح آتی ہے؟ عقل عمر سے آتی ہے۔ عقل تجربے سے آتی ہے۔ عقل شعور سے آتی ہے۔ عقل حالات کی تبدیلی سے آتی ہے۔ عقل حادثات سے آتی ہے۔ عقل تعلیم سے آتی ہے۔ عقل ادراک سے آتی ہے۔ عقل مشاہدات سے آتی ہے۔ عقل ریاضت سے آتی ہے۔ عقل کیسے آتی ہے؟ عقل کا ذریعہ اظہار کیا ہے؟ عقل ہے کیا؟ عقل کیوں ضروری ہے؟ کیا عقل کے بغیر انسان اپنے معاملاتِ زندگی انجام نہیں دے سکتا؟ ساری عمر ہم ایک دوسرے کو عقل سے کام لینے کا درس دیتے رہتے ہیں۔ عقل کا ہنر سکھاتے ہیں۔ عقل کے آنے کے ذرائع سے آگاہ کرتے ہیں۔ بچوں کو بادام کھلاتے ہیں، اخروٹ اور مجون کھلاتے ہیں۔ عجیب سی بات ہے۔ انسان ساری عمر ایسی عقل سیکھنے میں لگا دیتا ہے جس سے کسی نقصان کا اندیشہ نہ رہے۔ والدین اُولاد کو عقل سکھاتے ہیں۔ اُولاد والدین کو عقل سکھاتی ہے۔ اُستاد طالب علموں کو عقل سکھاتا ہے۔ شاعر لوگوں کو عقل کا ہنر دیتے ہیں۔ عقل کسی کے پاس ہے بھی کہ نہیں؟ عقل کا صحیح ترین استعمال کیا ہے؟ عقل کا یہ استعمال کہاں، کس طرح، کب اور کیوں اور کیسے کرنا چاہیئے؟ عقل کی تفہیم کیا عقل ہی کرتی ہے۔ عقل کی بھی ایک عقل ہے یا عقل ہی دراصل عقل ہے؟ میرا خیال ہے عقل کو سیکھنے کی ضرورت ہی نہیں۔ عقل کا استعمال کرنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ عقل کا استعمال انسان کو عقل مند نہیں بنا سکتا۔ عقل کوئی نقصان یا فائدہ نہیں دے سکتی۔ عقل کا پیچھا چھوڑ کر اپنے پیچھے پڑ جائیں۔ اپنے آپ کو معاملاتِ زندگی میں ڈھالنے کی کوشش کریں۔ عقل کو اپنا کام کرنے دیں۔ آپ خود کو اپنے آپ کے حوالے کر کے بیچ میں سے الگ ہو کر اپنا کام کرتے رہیں۔ کام ہوتا رہے گا تو وقت بھی گزرتا رہے گا۔

مجھے غریب گھر میں پیدا ہونے پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ دُکھ اس بات کا ہے کہ مجھے غریب ذہن کے حامل لوگوں میں پیدا کیا گیا۔

دُنیا میں غریب ترین انسان نہیں بنا جا سکتا۔ دُنیا میں امیر ترین انسان بھی نہیں بنا جا سکتا۔ صرف انسان بنا جا سکتا ہے اور ہم انسان بننا گوارا نہیں کرتے۔

انسان اگر یہ سمجھ لے کہ دُنیا میں پیدا ہونے کے بعد دُنیا میں اور کچھ پیدا نہیں کرنا تو وہ مطمئن ہو کر بغیر پیدا ہوئے کسی دوسرے جنم کو پیدا کر سکتا ہے۔

مرد کبھی نہیں بدلتے وہ اپنی جبلّی عادتوں کے تابع ہوتے ہیں بس ان عادات اور اطوار کا علم کبھی بہت جلد اور کبھی بہت دیر میں ہوتا ہے۔

کسی اچھے شخص کی تلاش کے لیے مارا مارا پھرنے کی بجائے خود کو اچھا بنالو۔ شائد اس عمل سے کسی دوسرے کی تلاش ختم ہو جائے۔

مرد کے لیے عورت ایک کھلونا یا ٹشو پیپر ہو سکتی ہے مگر عورت کے لیے ایک مرد کا وجود ایک نفیس اور انمول لباس کی طرح ہوتا ہے جسے اپنے برہنہ وجود پر اُوڑھ کر عورت زمانے کی سختیاں اور مصائب برداشت کرتی ہے۔ یہ لباس اس کی روح اور جسم کی حفاظت ہی نہیں کرتا بلکہ اس کی عزت نفس، ناموس کی حفاظت اور پہچان کا مظہر ہوتا ہے۔ عورت اس قیمتی اور انمول لباس کو کسی دیگر عورت سے کبھی شیر (تبادلہ) نہیں کر سکتی، کیونکہ یہ اٹوٹ رشتے اور لازوال احساس کا لباس ہوتا ہے جسے شیر (تبادلہ) کرنے سے اس کی چمک ماند پڑ جاتی ہے جس سے یہ ناقابل استعمال اور ناقابل اعتماد ہو کر رہ جاتا ہے۔

دُنیا میں سے کسی ایک شخص کا انتخاب کرنا بہت آسان کام ہے لیکن کسی تنہا شخص کو دُنیا کے سامنے قبول کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔

پیار کی شادی میں جذبات کا دریا بہ جائے تو خشک ریت اور گہنہ پاٹ کے سوا کچھ باقی نہیں رہتا۔

موت انسان سے صرف زندگی چھین سکتی ہے لیکن بے وفائی انسان سے پیار کا حق چھین لیتی ہے۔

حقیقت چھپانے سے حقیقت کا اظہار کر دینا بعض اوقات بہت سے جذبوں اور رشتوں کو برباد ہونے سے بچالیتا ہے۔

رشتوں کو بنانے اور بگاڑنے کا انحصار عورتوں کی باہمی رضا مندی اور خواہش کی ہم آہنگی پر منحصر ہوتا ہے۔

حقیقت کو تسلیم کر لینے سے اطمینان کی دولت نصیب ہوتی ہے ورنہ شکست کی کسک روح کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے۔

لڑکے کا اپنے رشتے سے انکار کرنا ایک معمولی بات سمجھی جاتی ہے لیکن اگر لڑکی انکار کر دے تو اس پر شک کیا جاتا ہے، تہمت لگائی جاتی ہے، گلے شکوے اور تنقید کے انبار لگ جاتے ہیں۔ اس کا جینا حرام اور سکون تباہ کر دیا جاتا ہے۔ اسے تشکیک کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے۔ اس کے قول و فعل پر کڑی نظر رکھی جاتی ہے۔ اس کا کھانا پینا حتی کہ اس کی سوچ پر پہرے بٹھائے جاتے ہیں اور پھر کوئی معقول اجنبی سا رشتہ دیکھ کر اس کی خواہش کے خلاف اسے شادی کے سمجھوتے میں باندھ کر یوں رخصت کر دیا جاتا ہے جیسے صدیوں سے ذہنوں اور جسموں پر پڑا ہوا بوجھ ہٹ گیا ہو۔ ایک عورت کے ساتھ معاشرہ اس طرح کا نفرین آمیز سلوک کرتا ہے تو مرد کے ساتھ کیوں نہیں؟؟؟؟۔ اسلام تو مساوات کا درس دیتا ہے، تو پھر کہاں ہے مساوات؟؟؟؟؟

والدین کے فیصلوں کو خاموشی سے اُولاد قبول تو کر لیتی ہے لیکن کبھی دل سے تسلیم نہیں کرتی۔ ہوا کا رُخ بدلتے ہی اپنی خواہشوں کی تکمیل ضرور کرتی ہے جنھیں رشتوں کے احترام اور بڑے پن نے روک رکھا ہوتا ہے۔

فتح کو شکست میں بدلنا ممکن نہیں لیکن شکست کو فتح میں بدلنے کی کوشش کی جاسکتی ہے۔

محبت کرنے سے پہلے ظلم سہنے کا فن سیکھنا بہت ضروری ہے۔

دوستی میں شدت اپنائیت کی لذت سے محروم کر دیتی ہے۔ رشتوں میں اعتدال رشتوں کی استقامت کا مظہر ہوتا ہے۔

صداقت کا گلہ گھونٹ دینے سے جھوٹ کی فتح نہیں ہوتی۔

وہم شک کو جنم دیتا ہے، شک کو نظر انداز کرنا اتنا ہی مشکل ہوتا ہے جتنا وہم کو دل سے اثر سے ماورا کرنا۔

مخفی باتوں کی صحت مند غذا ہلکے پیٹ کی حامل عورتوں کو ہضم نہیں ہوتی۔

کسی شخص سے بچھڑ جانے کا احساس جب دل کی سیج پر بیٹھ جاتا ہے تو انسان اطمینان کی دولت سے محروم ہو جاتا ہے۔

عمر بھر کسی ایک شخص کو چاہنے کی بجائے دو لوگوں سے خود بہتر ہے۔

اکثر والدین بیٹوں کو کمیٹی سمجھتے ہیں جسے پچیس برس تک ڈالتے رہتے ہیں۔ مدت ختم ہوتے ہی اس کی ادائیگی کے لیے ان کے سر ہو جاتے ہیں۔ جب تک ان کے احسانات اور پرورش کی بمثل زر ادائیگی نہ کر دی جائے، تب تک باپ اور بالخصوص ماں بیٹے کی خواہشوں اور اس کے خوابوں پر پہرے بٹھائے رکھتی ہے، گویا تابع فرمان بیٹا ہونے سے مراد اپنی پیدائش سے لے کر ذمہ دار شہری بننے تک کے تمام مراحل کا بمثل زر ادا کرنا لازم ہے۔ اس ادائیگی میں تاخیر یا اختلاف کی صورت میں بیٹے کو اس کی خواہش اور پسند سے والدین ارادتاً محروم رکھتے ہیں جس کی حوصلہ شکنی لازم ہے۔

کسی بات یا واقعے کی حقیقت تک پہنچنے کے لیے ضروری ہے کہ اس بات یا واقعے کو شک کی نگاہ سے پرکھا جائے۔ کوئی بات یا واقعہ کبھی جوں کا توں نہیں ہوتا۔ بات یا واقعے کا ظہور ہونا اس کے ظاہر ہونے کی دلیل فراہم کرتا ہے۔

خودغرضی سے بہتر؛ خود شناسائی ہے جو انسان کو دوسروں کے سہارے سے ماورا کر دیتی ہے۔

محبت کرنا ضروری ہے لیکن صرف محبت کرنا کافی نہیں۔

بڑے لوگوں اور چھوٹے لوگوں میں اتنا ہی فرق ہے جتنا دریا اور تالاب میں ہوتا ہے۔

علم حاصل کرنا بہت ضروری ہے لیکن صرف علم حاصل کرنا ضروری نہیں۔

پہلی محبت کو اکثر مذاق سمجھا جاتا ہے لیکن یہی مذاق روگ بن جائے تو زندگی تباہ ہو جاتی ہے۔

کنارے محدود ہونے سے روانی میں فرق نہیں پڑتا۔

سب کچھ جاننے سے بہتر ہے کچھ بھی نہ جانا جائے۔

انسان وقت کے ساتھ خود کو اپنے مزاج اور معاشرے کے دستور کے مطابق ڈھالنے کی ذہنی کوشش شروع کر دیتا ہے۔ اوائل شباب کے جذبات کھولتے ہوئے تیل کی مانند ہوتے ہیں جن میں انسانی قدریں سرسوں کے دانوں کی طرح جل کر راکھ ہو جاتی ہیں لیکن ان اقدار کا وجود کبھی ختم نہیں ہوتا بلکہ یہ اس جلتے ہوئے تیل کا حصہ بن کر اس کی حدت کو اس قدر ماند کر دیتی ہیں کہ یہ ایک جمے ہوئے برف کے ٹکرے کی صورت اختیار کر جاتا ہے۔ وقت کا بھی ایک مزاج ہوتا ہے۔ یہ انسان کو اپنے مزاج کے مطابع ڈھلنے کی گنجائش ضرور دیتا ہے، لیکن انسان کے مزاج کے مطابق نہیں ڈھلتا۔

انسان کو گالی بکنے یا تھپڑ مارنے کی بجائے کسی دیوار کو گالی بک لیں اور تھپڑ بھی مار لیں۔ دیوار بھی احساس رکھتی ہے۔ اسے بھی درد ہو گا۔ اس کا بھی دل دُکھے گا لیکن یہ خاموش رہے گی، پلٹ کر وار نہیں کرے گی۔

لڑکے ماچس کی جلتی سلائی کی طرح ہوتے ہیں۔ ابھی جلے، ابھی بجھے کہیں آگ لگی، کہیں دُھواں اُٹھا، کہیں جُڑ مُڑ ہو کر خم کھا گئے۔

لوگوں کو مذہبی، معاشرتی اور روایتی نظروں سے مت دیکھو، انھیں آنکھوں کی پُتلیاں ہٹا کر برہنہ آنکھوں سے دیکھو، بالکل صاف اور دُھلے ہوئے نظر آئیں گے۔

بچے پھول کی طرح ہوتے ہیں جن کے بدن میں چنبیلی کی خوشبو ہوتی ہے جو اجنبیت کے تمام تقاضے ہٹا کر انسان کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔

لڑکیاں سرسبز کھیت کی طرح ہوتی ہیں جن کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سکون ملتا ہے اور ان کے لمس کی ٹھنڈک قلب و روح کی رگ رگ میں سرائیت کر جاتی ہے۔

عورت کانچ کے ٹکڑے کی طرح ہوتی ہے جو کرچیاں ہو کر بھی نگینے کی طرح فروزاں رہتی ہے۔ آدمی سورج مکھی کے پھول کی طرح ہوتا ہے جو سورج کے رُخ پھیرنے سے اپنا رُخ پھیر لیتا ہے۔

معاشرہ کبھی اپنے اصول اور معیار نہیں بدلتا۔ یہ لوگوں کے جذبات سے کھیلتا ہے۔ اس کی انا اپنی منتہا کے فلک پر متمکن ہوتی ہے اس کو شکست دینے کے لیے سقراط جیسا حوصلہ، قیس جیسی دیوانگی، مہینوال جیسا انتظار، ہیر جیسا عشق، رانجھے جیسی چاکری، مرزا جیسی برق رفتار درکار ہوتی ہے جو اس کی انا کے لات و منات کو اپنے پاؤں کی ٹھوکر سے اُکھاڑ کر اپنی منزل کا سنگِ بنیاد رکھنے کا حوصلہ رکھتی ہو۔

کچھ رشتے مجبوریوں کے تعلق سے جُڑے ہوتے ہیں جن سے الگ ہوتے ہوتے ان کی عادت سی پڑ جاتی ہے پھر مجبوری ہمدردی میں بدل کر دلی تسکین کا باعث بن جاتی ہے۔ دراصل رشتوں کی اہمیت اور اس کی نفسیات کا ادراک وقت کے بے اختیار گھوڑے کی بھاگ جیسا ہے جس پر سوار ہونے سے خود ساختہ منزل کا تعین کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ ہم جانتے سمجھتے ہوئے کہاں سے کہاں نکل جاتے ہیں اور سمجھوتے کی ڈور سے مجبوریوں کے رشتوں کو آزاد کرنے کی ناکام کوشش کرتے رہتے ہیں۔

پیار کی شادی ایک جوا ہے جو مقدر اور قسمت سے کھیلا جاتا ہے لیکن
حالات کمال ہوشیاری سے مقدر اور قسمت کے کس بل نکال دیتے ہیں۔

کسی کو یاد رکھنا بہت مشکل کام ہے اور جسے یاد رکھنا مشکل ہو جائے اسے
بھول جانا بہت دشوار ہوتا ہے، عمر بیت جاتی ہے بھولنے بھلانے میں، مگر
کوئی کہاں بھولتا ہے، کوئی کہاں یاد رہتا ہے۔

کسی کو موت دینے سے بہتر ہے اسے بے وفائی کی تاریک گلی میں تنہا
چھوڑ دیا جائے وہ خود اپنے وجود کے پُر ہول تاریک خلا میں گُھٹ گُھٹ
کر مر جائے گا۔

کسی شخص کو اپنانے کا اختیار دل کی تصدیق کے ساتھ وابستہ ہوتا
ہے، محبت کا اظہار کر دینا بعض اُوقات اضطراب کی کسک سے روح کو
سُلگنے سے بچا لیتا ہے۔

محبت پا لینے کا نام نہیں ہے، بعض دفعہ محبت کھو دینے سے انسان کو وہ قلبی
تسکین اور روح کو اطمینان نصیب ہوتا ہے جو محبت کو پا لینے سے حاصل
نہیں ہوتا۔

عجیب سی بات ہے۔انسان کو تخلیق خدا کرتا ہے اور زندگی گزارنے کا
طریقہ بھی فطرتی طور پر ودیعت کرتا ہے لیکن پہلے سے موجود دُنیاوی
لوگ آنے والے انسانوں کے لیے احتیاطاً کچھ ایسے دستور بنا دیتے ہیں
جو ان کی زندگی بھر کا نچوڑ ہوتے ہیں جو اچھائیوں، برائیوں، کجرویوں
اور ناکامیوں کا مجموعہ بن کر بزرگیت کا لبادہ اُوڑھ کر ایک شیر خوار بچے
کے سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں اور اپنے خود ساختہ دستور کے اطلاق
کے لیے اس معصوم انسان کی زندگی اور خدائی طرزِ حیات کے نظام کو کچل
کر رکھ دیتے ہیں۔عجیب سی بات ہے نا!!!!! غور کریں، کیا آپ بھی اس
بزرگیت کے ظالمانہ سماجی لبادے کی ضد میں ہیں ؟؟؟ پھر کیا کرنا
چاہیے، ان سماجی لبادوں کو اُتار کر اسلام کے صحیح انسانی تقاضوں کے
مطابق زندگی گزارنی چاہیے یا پھر روایت کے تسلسل کا سہارا لے کر اپنی
زندگی کے فطری نظام کو تباہ کر لینا چاہیے۔کیا کہتے ہیں آپ؟؟؟؟ کیا
کرنا چاہیے، بولیں۔

میرے دوست تو بہت زیادہ ہیں لیکن دشمن کوئی نہیں ہے لیکن جب میں دوستوں کو شک کی نگاہ سے دیکھتا ہوں تو یہ سب دشمن سے دکھائی دینے لگتے ہیں۔ گویا دوستی اور دشمنی کا رشتہ شک کے احساس میں چھپا ہوا ہے۔

کسی شخص سے محبت ہو جائے تو اظہار کے معاملے میں انا کو درمیان میں حائل مت کرو ورنہ محبت ایک کھیل کے سوا کچھ نہیں رہتی جس کا اختتام کسی ایک کی ہار پر منتج ہوتا ہے اور ہارنے والا پھر کبھی محبت نہیں کر پاتا۔

اشفاق احمد (مشہور ادیب) کہتے ہیں کہ انسان کو زندگی میں بارہ عشق ہوتے ہیں۔ میں کہتا ہوں انسان کو زندگی کے ہر لمحے میں عشق ہوتا ہے۔ بس چاہنے والا دل اور انتظار کرنے والی آنکھ چاہیے۔

مجھے عورتیں اچھی لگتی ہیں اور مرد بُرے لگتے ہیں کیونکہ عورتیں بیری کے درخت کی طرح جھک جاتی ہیں اور پھل پاتی ہیں۔ مرد ببول کی طرح اکڑ جاتے ہیں، ان کے پاس کانٹوں کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

میں ہر روز یہ عہد کرتا ہوں کہ آنے والا دن کسی اچھے کام میں گزاروں گا۔ دن گزر جاتا ہے۔ اچھا کام نہیں کر پاتا۔

یہ ضروری نہیں کہ دو لوگوں کے درمیان ہمیشہ ایک سا رشتہ، ایک سے جذبات اور ایک سے خیالات کی ہم آہنگی پائی جائے۔ بعض دفعہ بہت قریب رہتے ہوئے بھی باہم میلوں کے فاصلے حائل ہوتے ہیں جنھیں پاٹنے کے لیے لمحوں کا فاصلہ بھی صدیوں میں طے ہوتا ہے۔ رشتوں کا تسلسل جذبات اور احساس کی نازک ڈور سے بندھا ہوتا ہے جسے برقرار رکھنے کے لیے صبر، تحمل اور ظرف کا مظاہرہ کرنا بہت ضروری ہوتا ہے۔

رشتوں کو حوالوں کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ حوالے رشتوں کے محتاج ہوا کرتے ہیں۔ رشتوں کو کسی کے سامنے ثابت نہیں کرنا چاہیے کیونکہ رشتے ثابت کرنے سے رشتے نہیں رہتے، کاروبار اور لین دین کا معمول بن جاتے ہیں۔ کسی مفروضے کا تجربے سے گزر کر حقیقت بن جانا کوئی معنی نہیں رکھتا، مفروضے میں مشاہدے کی آمیزش مجاہدہ بن کر بے خودی کا تریاق بن جاتی ہے۔

ہم اپنی پسند کی چیز، خواہش یا مرد عورت کو چند خوبیوں اور ہزار ہا خامیوں کے باوجود قبول کر لیتے ہیں لیکن خود اپنی ذات کو کبھی معمولی سی خامی کے ساتھ قبول نہیں کرتے۔ کیوں؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟؟ شائد ہم خود اپنی ذات سے محبت ہی نہیں کرتے !!!!!!!!!!!!!!!!!

پیار کی شادی میں کامیابی کا انحصار جذباتی باتوں اور ارادوں سے نہیں ہوتا بلکہ کسی ٹھوس رشتے کے تسلسل کے تابع ہوتا ہے جس کی ڈور جذباتی اور خودساختہ اختلاف سے ٹوٹنے کی بجائے اور پختہ ہوتی ہے۔

عورت اپنی زندگی میں آنے والے پہلے مرد کو کبھی نہیں بھلا سکتی۔ مرد کے بارے میں کیا خیال ہے؟؟؟؟؟؟؟؟؟ یہی نا کہ مرد جھوٹے ہوتے ہیں۔ سنو! کبھی اسے جھوٹا مت کہنا۔ ہو سکتا ہے یہی پہلا مرد تمھاری زندگی کے دروازے پر پہلی دستک دے جائے۔

انسان کی ہمیشہ سے یہ خواہش رہی ہے کہ اسے چاہا جائے، اسے سراہا جائے، اس کی پرستش کی جائے، اس کی اہمیت کا احساس اس کی خواہش اور معیار کے مطابق کیا جائے، اسے خوش رکھنا، اس کا دل بہلانا، اس سے ہمدردی کرنا، اس کے لیے جان سے گزر جانا، یہ ایسی منہ زور خواہشیں اور معیار کا ایسا گورکھ دھندہ ہے کہ انسان ایک دفعہ اس کنویں میں جھانک کر دیکھ لے تو اس میں پوری طرح گر جاتا ہے، پھر کبھی اس کے سحر سے نکل نہیں سکتا۔ انسانوں کو قبول کرنے کے لیے کسی معیار، دلیل یا ثبوت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ واہمے، خیالات اور سوچ کا رُخ رشتوں اور انسانوں کی اہمیت کو متعین کرتے ہیں۔ انسان انسانوں سے جُڑ کر رہتے ہیں، انسان خیالات، تصوررات یا سوچ کے کچے دھاگے سے نہیں بندھے ہوتے جنھیں ہوا کا ہلکا سا مخالف جھونکا توڑ کر تار تار کر دے۔

انسان کا سب سے بڑا دشمن انسان خود ہوتا ہے۔ انسان اپنے آپ سے صفِ آرا رہتا ہے۔ اپنی ذات کو شکست دینے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ اپنے آپ سے نکل جانا چاہتا ہے۔ اپنے وجود سے اس کو گھٹن ہوتی ہے۔ اپنے آپ سے خفا رہتا ہے۔ انسان کا سب سے بڑا دشمن انسان خود ہوتا ہے۔

اچھا طالب علم وہ ہے جو علم کو خیرات یا لنگر کی طرح لوگوں سے جھپٹ کر، چھین کر حاصل کرتا ہے۔ درخت کے نیچے بیٹھ کر پھل کے گرنے کا انتظار کرنے سے بہتر ہے، پتھر اُٹھا کر اپنے حصے کا پھل اُتار لیا جائے۔

مجھے خدا سے ڈر نہیں لگتا۔ میرے گناہ اتنے زیادہ نہیں کہ میں خدا سے منہ چھپاتا پھروں۔ وہ اگر ستر ماؤں سے زیادہ محبت کرتا ہے تو میں ستر بچوں سے زیادہ گناہ گار بھی ہو جاؤں پھر بھی اس کی گود میرے وجود کی منتظر رہے گی۔ مجھے خدا سے کبھی ڈر نہیں لگتا۔ آپ کو لگتا ہے؟؟؟؟؟

بیٹیاں نعمت ہوتی ہیں، گھر کا سکھ چین اور ماں باپ کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہوتی ہیں۔ بیٹیاں ماں باپ پر بوجھ نہیں ہوتی، آنگن میں چڑیوں کی طرح چہچاتی ہیں، شور مچاتی ہیں، دانہ چگتی ہیں اور ایک دن کسی اجنبی بندھن سے جڑے ہوا کے دوش پر اُڑ جاتی ہیں، بس اتنا مختصر سا پڑاؤ ماں باپ کی زندگی کا حاصل ہوتا ہے۔ بیٹیاں بوجھ نہیں ہوتی۔ بوجھ تو خیالات ہوتے ہیں، تصورات ہوتے ہیں، افکار و اعلام ہوتے ہیں جو ذہن کے اُفق پر نیلگوں چھتر تان کر ایستادہ رہتے ہیں جن سے فرار کی کوشش ایک نئی کشمکش میں مبتلا کر دیتی ہے۔ یہ ایک ایسا تانا بانا بُن دیتی ہیں انسان کے اردگرد جس کی تال میل اور ترتیب و تنظیم سے انسان کو خود کو آزاد کرتے کرتے اسی کا اسیر ہو کر رہ جاتا ہے۔

زندگی انسان کا امتحان ضرور لیتی ہے کیونکہ اس کی جبلّت میں شامل ہے ،یہ دیکھنا چاہتی ہے کہ مجھ میں سانس لینے والا میرے امتحان میں کتنا ثابت قدم ہے اور کیا میری بے رُخی اور سخت رویئے پر یہ مجھ سے نالاں ہو کر اپنا راستہ الگ کرلے گا یا ماں کی طرح مجھ سے لپٹ جائے گا۔ زندگی ایک ماں، ایک محبوب، ایک خوبصورت بیوی اور خوبصورت لمحے کی طرح ہوتی ہے جس کی نفسیات کو سمجھنے میں ایک مدت صرف ہوتی ہے لیکن اس کی سمجھ پھر بھی نہیں آتی ۔ زندگی کو سمجھنے سے زندگی انسان کو امتحان میں ڈال دیتی ہے۔ زندگی کو سینے سے لگا کر اسے محبت بھری لوری سنائیں، اس سے ناراض مت ہوں ۔ یہ جہاں خوشیاں دیتی ہیں وہاں تھوڑا غم بھی دیتی ہے۔ کامیابی کے ساتھ تھوڑی ناکامی بھی دیتی ہے۔ یہ انسان کی شخصیت میں اعتدال اور توازن پیدا کرتی ہے۔ اسے اپنی مرضی کے مطابق مت ڈھالیں بلکہ اس کے سانچے میں ڈھل جائیں۔ اس کی تراش خراش کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ بہار کے پھول کی طرح دل کے آنگن کو مہکا دیتی ہے۔ زندگی خوبصورت ہے، اس سے پیار کریں، اسے سے جُڑ کر رہیں ورنہ آپ کی بے رخی کی ہلکی سی جنبش اسے آپ کے وجود سے کوسوں دور لے جائے گی پھر کبھی یہ رُو برو نہیں ہوگی۔

شوہر اپنی بیوی کی محبت سے بہت جلد مکر جاتا ہے لیکن بیوی اپنے شوہر کی محبت سے کبھی نہیں مکرتی کیونکہ اس کے وجود میں ایک ماں کا احساس سانس لے رہا ہوتا ہے۔ شوہر مرد بن کر زندگی کی سب تلخیاں برداشت کر سکتا ہے لیکن عورت زمانے کی گرد ہوا سے اپنے نحیف وجود کو بچا نہیں سکتی۔ ہمارے مشرقی معاشرے میں ہمیشہ عورت کو گھر سے نکلتے دیکھا ہے، خواہش ہے کہ مرد کو عورت کی طرح گھر سے نکلتے دیکھوں، پھر رشتوں کی اہمیت میں توازن اور اعتدال کا احساس مرد کے رویئے میں پیدا ہوگا۔

سہارے کے بغیر زندگی گزارانا مشکل ضرور ہے لیکن پیار کے بغیر زندگی موت بن کر سانس کے کچے دھاگے سے کھیلتی رہتی ہے جس کے ٹوٹ جانے کا خوف روح کے بدن پر اتنے شگاف کرتا ہے کہ جسم کی پردگی انسان کی باطنی برہنگی کو چھپانے میں ناکامی کا ڈھنڈورا پیٹ کر انسان کو حسِ آگاہی اور لطافتِ زیست کے سب رنگوں سے محروم کردیتی ہے۔

ذہنی طور کسی شخص سے جڑے ہوئے خیال یا ارادے کو تسلیم کر لینے سے انسان دلی طور پر اُس خیال یا ارادے سے محظوظ ہو لیتا ہے جس کا خیال ارادہ بن کر ذہن کے اُفق پر نمودار ہوتا ہے، جسم کی حلاوت روح کی تسکین چھین لیتی ہے۔

ماں، بہن اور بیٹی کا صرف ایسا رشتہ ہے جن کے خلوص میں کبھی کھوٹ نہیں ہوتی۔ بھائی، باپ 'ور بیوی انا کے حصار میں مقید ایسی کٹھ پتلیاں ہوتی ہیں جو کبھی ان گھٹن تصورات سے خود کو عمر بھر باہر نہیں نکال پاتے۔

حادثوں کے پیچھے بعض اُوقات کئی بھلائیاں بھی چھپی ہوتی ہیں جن کا ہمیں علم نہیں ہوتا لیکن محض کسی بھلائی کے حصول کے لیے حادثے کو قبول کرنا یا حادثے کا سبب بننا زندگی کی خوشیوں سے ہمیشہ کے لیے محروم کر دیتا ہے۔

کسی شخص یا رشتے سے محروم ہونے یا جدا ہونے سے زندگی کا نظام ایک دفعہ بے ترتیب ضرور ہوتا ہے لیکن زندگی کبھی بھی کسی ایک شخص تک محدود نہیں رہتی۔ وقت کے ساتھ زندگی اپنے آئیڈیل کی تجدید ضرور کرتی ہے اور پھر گرد و نواح کے خونی، رسمی اور دُنیاوی رشتے سہارا دے کر زندگی کی پُر رونق فضا میں لوٹنے میں ایک کلیدی کردار ادا کرتے ہیں، لیکن معاشرے کے لوگ اور اس کے بنائے ہوئے روایتی خودساختہ دستور ایسے مرد اور عورت کو بنجر زمین سمجھ کر اپنائیت کے رین بسیرے سے محروم کرنے کی سخت تر کوشش کرتے ہیں۔ کچھ مظلوم و محکوم اس بنجر پن کی خشک سالی سے بددل ہو کر محرومی کے گورکھ دھندے میں ہمیشہ کے لیے کھو جاتے ہیں، کچھ خود کو سنبھالا دے کر جینے کی آس جگائے رکھتے ہیں، کچھ حالات سے سمجھوتہ کر کے موسمِ بہار سے منہ موڑ کر اپنی عمر کی تشنگیِ لذتِ زیست میں گزار دیتے ہیں۔ تاہم ان میں کچھ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو اپنی خودداری کی روح میں بغاوت کا الاؤ جلا کر زمانے کی تمام حدوں اور خودساختہ دستوروں کو جلا کر راکھ کر دیتے ہیں اور ثابت کر دیتے ہیں کہ زندگی کسی ایک شخص کے وجود سے محروم ہونے یا جدا ہونے سے ختم نہیں ہو جاتی بلکہ یہ اکائی کی ربوبیت سے تسکین حاصل کر کے پھر سے کئی رنگوں میں سنورتی، سجتی، بہار کے غلغلوں میں محوِ آشام بہار جاوفان مسرت بن کر روح و قلب کو تسکین کی لذت سے محظوظ کرتی ہے۔

کبھی کبھی اپنے حق کے لیے بت میز ہونا پڑتا ہے۔ کبھی کبھی اپنے حق کی جنگ اپنے گھر سے شروع کرنی پڑتی ہے۔ اپنے حق کے لیے کوشش کرنا ہی اپنے حق کا بہترین استعمال ہوتا ہے۔ جو لوگ اپنا حق کسی اور کے حوالے کر کے ان کی خواہش کے حصول کا ذریعہ بنتے ہیں وہ تابع فرمان نوکر تو بن سکتے ہیں، کامیاب اور باکردار انسان نہیں۔

اچھے دوست بعض اُوقات اچھے جیون ساتھی نہیں بن پاتے ۔ جذبات میں خلا ہونے سے رشتوں میں اعتدال رہتا ہے انھیں قُرب میسر آجائے تو دلی اپنائیت کا احساس ختم ہو جاتا ہے۔

بے رُخی اور دیوانگی کے درمیان سمجھوتہ نہیں ہوسکتا البتہ دیوانگی میں تسلسل کی شدت ہو تو بے رُخی کو توجہ میں بدل کر محبت میں بدلا جا سکتا ہے۔

الفاظ گونگے بہرے اپاہج اور لاوارث ہوتے ہیں انھیں زبان کے تازیانے سے گویا کیا جاتا ہے۔ یہ کوئی اثر نہیں رکھتے ۔ انھیں زبان کے لمس سے رنج و راحت کی حس سے آگاہ کیا جاتا ہے۔

جس شخص سے محبت ہو جائے اس سے پھر کبھی نفرت نہیں ہوسکتی۔ اگر حالات کی گردش محبت پر نفرت کو غالب کر دے تو یقین کر لو کہ محبت کبھی ہوئی ہی نہیں بلکہ محبت کی ایک پرچھائی نے دل کو پل بھر کے لیے موہ لیا تھا۔

لہجے کی بیگانی اور رسمی جملوں کا سہار لینے والے لوگوں کے رویے مستقل رشتے میں ایک گہری دراڑ ثابت ہوتے ہیں، جنھیں محبت کی طاقت پاٹ نہیں سکتی۔

محبت میں مفاد کی آمیزش اُس بجھے ہوئے چراغ کی مانند ہے جس کی مدھم لو سے تاریکی اور اُجالے میں فرق کرنا ممکن نہیں رہتا۔

جس کام، عمل یا حرکت کے ہونے کے بعد آپ کا ضمیر شدت سے ملامت کرے وہ کام، عمل یا حرکت عادت نہیں رہتی بلکہ گناہ بن جاتی ہے جس سے توبہ اور کفارہ لازم ہے ورنہ پچھتاوے کا احساس روح کو جلا کر راکھ کر دے گا اور اس کی بازپُرس بھی روزِ قیامت ہوگی۔

زمین اور انسان مسلسل ایک مرکز کے گرد چکر کاٹ رہے ہیں اور وہ مرکز اللہ کی ذات ہے۔اللہ نے انسان کے باطن کا پھیلاؤ اس کائنات سے کہیں زیادہ لامحدود رکھا ہے۔اس کائنات میں سب سے بے چین جس ذات کا وجود ہے اسے قوتِ لا یموت نے مخلوق یعنی انسان کے لقب سے ملقب کیا ہے۔اس بے چین پھیلاؤ کو سمیٹ کر رکھنے کے لیے اللہ نے ہر زمانے میں کئی نبی اور پیغمبر بھیجے ہیں لیکن جس مخصوص ذات کی اطاعت اور شریعتی نظام تک اللہ نے اپنی اطاعت اور حکم کو ہمیشہ کے لیے لاگو کر دیا وہ رسول نبی رحمت دو عالم ﷺ ہیں جس کی اطاعت گویا اس کائنات کے آخری پیدا ہونے والے بشر تک محیط ہے، گویا اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کا نام دین ہے، جس کا فہم حاصل کرنے کے لیے شعور کے حواس کا متحرک ہونا بمقتضائے ایزدی ضروری ہے، وگرنہ ذہنی پستی کے گھٹاٹوپ اندھیرے میں بشریت محوِ بے کنار، لا حاصل جستجوِ منزل رہتی ہے۔

کسی شخص سے نفرت کرنے سے بہتر ہے اسے نظر انداز کر دیا جائے ،نظر انداز کرنے کا رویہ ایسا ستم رسیدہ زخم ہے جو کینسر بن کر انسان کی جان لے لیتا ہے۔

جب تک باپ اُولاد کی تربیت اور ماں اس کی پرورش کا فرض خوش اسلوبی اور نیک نیتی سے ادا نہیں کریں گے تب تک اُولاد مہذب اور باکردار شہری بننے سے محروم رہے گی۔

یک طرفہ رشتے ٹوٹے ہوئے دھاگے کا ایک سرا ہوتے ہیں جس کا دوسرا سرا تلاش کرتے کرتے انسان خود ایک تلاش بن کر رہ جاتا ہے۔

ماں اور بیوی میں سے کسی ایک کو جھوٹا یا سچا ثابت کرنا ایک بیٹے اور شوہر کے لیے اتنا ہی مشکل ہے جتنا ڈوبتے ہوئے مسافروں میں سے کسی ایک کو باہر نکالنے کا انتخاب کرنا۔

ماں کی محبت میں اعتدال ہو تو اُولاد سعادت مند اور تابع فرمان ہوتی ہے۔شدت کسی بھی جذبے کو اس کی لذت اور تسکین سے محروم کر دیتی ہے۔

عورت مرد کی انا اور نفس کا تماشا نہیں ہے، جہاں ننگی تلوار کے سامنے کسی طاقتور کی گردن نہ ٹھہرتی ہو۔ عورت کی پاسداری اور اس کی پاک دامنی کا احترام نبی اکرم ﷺ نے آج سے چودہ برس پہلے میدان کارزارِ بلائے جان میں کیا تھا اور اہل عرب کو بتلایا تھا کہ عورت کو کوئی کٹھ پتلی یا رقص کا کھلونا مت سمجھو، جسے حسب خواہش نچوا کر محظوظ ہولیا جائے، بلکہ اس کے وجود سے اس کائنات کے وجود کی تکمیل ہوئی ہے۔ اس کے ساتھ مساوات اور برابری کا سلوک کرو، اسے کسی حق سے محروم کرنے یا اس کا حق غصب کرنے کی ہرگز اجازت نہیں ہے۔ یہ حق جائیداد میں ہو، رشتے میں ہو، چاہے تمھارے جذبات کے ساتھ جڑا ہوا ہو۔ ان پرہیزگار عورتوں پر بدکرداری کا الزام مت لگاؤ اور اگر تم یہ الزام ثابت نہ کر سکے تو الزام لگانے والوں کی سزا اسی دُرّے مقرر ہیں جس سے کسی کو بھی کوئی استثنا حاصل نہیں ہے۔ عورت جب ماں کا روپ دھارتی ہے تو رب اس کے پاؤں تلے جنت رکھ دیتا ہے جس کی تلاش میں زاہد و متقی اپنی عمر گزار دیتے ہیں۔ عورت ماں بنتے ہی محبت کا پیکر بن جاتی ہے، خواہ وہ کسی رنگ، نسل، گروہ، فرقے یا مزاج سے تعلق رکھتی ہو۔ عورت سے علیحدگی کے بعد ان کو دیا ہوا مال ہرگز واپس نہ لو۔ عورت کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرو۔ اس کے جذبات و احساسات کا لحاظ رکھو۔ اس کے مزاج کے مطابق معاملہ رکھو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم اپنی انا کے بھنور میں اپنی بشری تکمیل کے درجے سے ردّ دیے جاؤ۔

دُنیا میں کئی رشتے محض ضرورتوں کی تسکین کا سامان ہوتے ہیں جنھیں ہم استعمال تو کرتے ہیں لیکن اپنانے سے گریز کرتے ہیں۔

بیوی محض ایک عورت نہیں جسے خوبصورت غلاف میں چھپا کر گھر کی چار دیوری میں مقید کر دیا جائے۔ بیوی ایک شمع ہے جس کی لو سے گھر کی تاریکی اُجالے میں بدل جاتی ہے۔

دُنیا میں انسان تنہا آتا ہے لیکن جاتے وقت بہت سی حسرتیں اور آرزوئیں لے کر جاتا ہے جس کی کسک اس کی روح کو قبر کی تاریک گھٹن میں بھی بے چین رکھتی ہے۔

ہم لوگ محض اس لیے لوگوں کو تکلیف دیتے ہیں کیونکہ ان کی موجودگی ہماری زندگی کے رویئوں میں خلل کا باعث بنتی ہے لیکن ہم بھول جاتے ہیں کہ ہماری اس عادت سے معاشرے کی قدروں میں ایسا بگاڑ پیدا ہوتا ہے جو آگ کی طرح رُوئی جیسے مخملی رشتوں اور قدروں کو جلا کر راکھ کر دیتا ہے۔

انسان کی تکمیل عشق کی تذلیل پر دلالت کرتی ہے اور عشق کی تکمیل انسان کی تحقیر پر منحصر ہے۔

شادی کے بعد عورت کو میکے سے چاہے کتنا ہی مالی و ذہنی سہارا اور سکون میسر کیوں نہ ہو، یہ ہمیشہ کڑے وقت میں سُسرال والوں سے مدد اور سہارے کی اُمید رکھتی ہے کیونکہ وہ سمجھتی ہے کہ شادی کے بعد میری زندگی اور زندگی کے تمام معاملات میں کُلی اختیار میرے سُسرال کا ہے وہ مجھے اپنے مزاج کے مطابق ڈھالنے کا پورا اختیار رکھتے ہیں اور مجھے نہ چاہتے ہوئے بھی ان کے مزاج اور گھریلو ماحول کے اطوار میں ڈھلنا ہو گا، چاہے اس کے لیے مجھے اپنی ذات، پسند ناپسند اور سوچ کے بہتے جھرنے کو منجمد ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ ایک مشرقی عورت انھی خصائص کی حامل ہوتی ہے اور ہونا بھی چاہیے۔ اسی میں اس کی عزت اور ازدواجی کامیابی کا راز پنہاں ہے۔

کسی ملک کو تباہ کرنے کے لیے سب سے آسان ہتھیار یہی ہے کہ اس کے خاندانی نظام اور اخلاقی اقدار میں آمیزش کر دی جائے۔

والدین اُولاد اپنی مرضی سے پیدا نہیں کرتے۔ یہ قدرت کا نظام ہے جس میں انسان خود مختار نہیں ہے لیکن اُولاد کے درمیان انتخاب ضرور کرتے ہیں۔ جو بچہ ماں کے دل کو بھاتا ہے وہ ماں کی شفقت سے پوری طرح لطف اندوز ہوتا ہے اور عمر بھر ماں اسے اپنے سائے سے دور نہیں کرتی لیکن بقیہ اُولاد کو نظر انداز کر کے اپنی پسند کے بچے اپنی تمام تر محبت، اپنائیت اور توجہ دیتی ہے۔ وقت کے ساتھ یہی بچہ بڑا ہو کر دوسرے بچوں کے حقوق پر ڈاکہ ڈالتا ہے اور اپنے مفادات کے حصول میں ماں کو جذباتی کر کے اس کی شفقت اور اعتماد حاصل کرتا رہتا ہے۔ ماں ایک جذباتی اور عام عورت کی طرح اس کی ہر خواہش کو پورا کرتے کرتے گور تک چلی جاتی ہے لیکن کبھی اس بات کا احساس اس کے ضمیر پر چوٹ نہیں کرتا کہ اس کی کُوک سے پیدا ہونے والے دیگر بچے بھی اسی شفقت اور محبت کے مستحق اور منتظر ہیں جنھیں اس کی یک طرفہ محبت اور توجہ نے ہمیشہ کے لیے ماں کی شفقت اور توجہ سے محروم کر دیا۔ اسی طرح جو بچہ باپ کو پسند ہوتا ہے۔ باپ اپنی پوری توجہ اور مال و دولت اس کے نام کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اپنے رویئے سے اس تاثر اور سوچ کا اکثر و بیشتر دیگر اظہار کرتا رہتا ہے۔ عمر بھر باپ کی گود سانپ کی طرح پلنے والا یہ بیٹا باپ کی شفقت اور ہمدردی کا دودھ پیتا رہتا ہے لیکن جب زبان خشک ہونے لگتی ہے پھر باپ کی ہتھیلی پر ڈس کر اپنی خودساختہ خواہشات

کے حصول کا سامان فراہم کرتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ جو بچے ماں یا باپ کی پسندیدگی اور معاشرتی معیار پر پورا نہیں اُترتے ان کی زندگی کس طرح بسر ہوتی ہے؟ کیا وہ بھی ماں باپ کے چہیتے بیٹے یا بیٹی کی طرح زندگی کی تمام خواہشات اور آرزوؤں کی تکمیل سے محظوظ ہوتے ہیں؟ کیا یہ اپنے والدین کی محبت سے سیراب ہوتے ہیں؟ کیا ان کی زندگی ان کے لیے ایک مقصدِ حیات ٹھہرتی ہے؟ کیا ان کو اپنے والدین کے رویے سے اختلاف ہوتا ہے؟ کیا وہ اپنا حق چھیننے کی کوشش کرتے ہیں؟ کیا انھیں وہ سب حقوق دیے جاتے ہیں جن کے یہ مستحق ہوتے ہیں؟ نہیں۔ کبھی نہیں۔ یہی بچے بڑے ہو کر ایک خودرو پودے کی طرح معاشرے کے ناسور بنتے ہیں۔ یہی بچے بڑے ہو کر چور، ڈاکو، زانی، قاتل اور وہ سب القاب اپنے سینے پر تمغے کی طرح سجاتے ہیں جو معاشرے اور ریاست انھیں تفویض کرتی ہے۔ والدین کو اپنی اُولاد میں یکسانیت اور مساوات قائم کرنی چاہیے۔ بچے بچپن کی عمر میں بہت حساس ہوتے ہیں۔ انھیں نظر انداز کرنا گویا اخلاقی اور معاشرتی قدروں کو موت دینے کے مترادف ہے۔ اُولاد میں کوئی پسندیدگی نہیں ہوتی۔ اُولاد میں فرق کسی صورت جائز نہیں کیونکہ یہ فرق اُولاد کی موت کا سبب بن جاتا ہے۔ کسی ملک کا ایک خاندن اپنی اخلاقی اور معاشرتی اقدار پر عمل پیرا ہو جائے تو ایک روشن اور ترقی یافتہ معاشرے کی وہ اینٹ ثابت ہوتا ہے جو دیوار کی بنیاد میں مدفن ہو کر دیوار کی مضبوطی کا حوالہ بنتا ہے۔ غور کیجیے اور اپنا رویّہ

تبدیل کیجیے ورنہ یہ بچے آپ کے معیار اور ذہنی سوچ کی وہ تصویر بن کر جلوہ گر ہوں گے کہ منہ چھپانے کے لیے کوئی آنچل میسر نہ آئے گا۔

ہمارے مشرقی معاشرے میں یہ تاثر بہت عام ہے کہ جب اُولاد جوان ہو جاتی ہے۔ پڑھ لکھ جاتی ہے تو اسے ہر معاملے میں خود مختاری دے دی جاتی ہے۔ یہ خود مختاری بعض اُوقات جوان اُولاد کی تباہی کا نتیجہ ثابت ہوتی ہے۔ اُولاد چاہے عمر کے کسی حصے میں ہو؛ اسے والدین کے سہارے اور توجہ کی ہمیشہ ضرورت رہتی ہے۔ پڑھ لکھ جانے کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ انسان اپنی اُوقات اور اقدار کو فراموش کر دے۔ بلکہ والدین کا فرض ہے کہ اُولاد کو اپنے معیار کے سانچے میں ڈھالنے کی بجائے اسے ایک باوقار شہری بنانے میں اس کی تربیت کے وہ تمام مراحل بخوبی انجام دے جو اسے کسی غلط راستے کی طرف قدم بڑھانے سے روک دیں۔

بچے کو پیدا کرنے کے بعد اس کی پرورش کر کے بڑا کر دینے سے ماں باپ کی ذمہ داری اور فرض ادا نہیں ہو جاتا۔ والدین کی سب سے بڑی ذمہ داری اُولاد کی تربیت ہے۔ اُولاد کی تربیت ایک ایسا فرض ہے جسے ہمارے مشرقی معاشرے میں بالکل نظر انداز کر کے اس فرض کو مدرسوں اور سکولوں کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ بالکل آسان فہم بات ہے کہ اُولاد کو پیدا کرنے کے بعد اس کی نگہداشت اور پرورش کرنا بہت آسان ہے

۔یہ کام تو ہوا، پانی اور مٹی بھی کرتی ہے زمین کی کوک میں کوئی دانہ گر جائے تو وہ اسے اپنے وجود میں چھپا کر اس کی جڑ اپنے سینے پر اُگا کر اسے مٹی کے سخت تر وجود سے باہر نکالنے کا موقع اور سہارا دیتی ہے پھر ہوا، پانی اور سورج مل کر اس کی پرورش میں اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔یوں چند دنوں میں یہ لاوارث بیج ایک تناور درخت کی صورت زمین کے سینے پر اکڑ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ہر مذہب میں پرورش کی بجائے اُولاد کی تربیت کا حکم دیا گیا ہے۔کوئی مذہب ایسا نہیں ہے جس میں اُولاد کی تربیت پرزور نہ دیا گیا ہو۔ایک کامیاب خاندان کی ترقی اور خوشحالی کا راز گھر کے ماحول، والدین کی باہمی ہم آہنگی اور توجہ پر ہوتا ہے۔والدین کا اصل فرض تب شروع ہوتا ہے جب بچہ چلنا سیکھ جاتا ہے۔اسے چلتا دیکھ کر پیچھے ہٹنے کی بجائے اس کی راہنمائی کریں اور زندگی کے سبھی نشیب وفراز میں اس کے ہمدرد اور ہمنوا بن کر ان کے ہم سفر ہیں۔اُولاد کو والدین کے سہارے کی عمر بھر ضرورت رہتی ہے۔عمر کے کسی حصے میں آپ اس فرض سے سُبک دوش نہیں ہو سکتے۔

پاکستان اور پاکستانی عوام کے پاس اب اپنی شناخت کو کوئی حوالہ نہیں رہا جس کے بل بوتے پر یہ دُنیا کے سامنے اپنی انفرادیت اور تشخص کا اظہار کر سکیں۔پاکستان کے پاس نہ کوئی اخلاقی اقدار رہی ہیں نہ ہی کوئی معیارِ زندگی قابل تقلید بچا ہے۔اس ملک کا خاندانی نظام مغربی تقلید پرستی کی وجہ سے تقریباً تباہ ہو چکا ہے۔پاکستان کی تہذیب، ثقافت، رسم و رواج اور بود و باش سب میں مغربی تہذیب کا اس قدر غالب امتزاج جڑ پکڑ چکا ہے کہ ہم خود کو دیگر اقوام سے اگر پل بھر کے لیے الگ کر کے دیکھیں تو بالکل برہنہ نظر آئیں گے۔مردوں اور عورتوں کے لباس میں فرق باقی نہیں رہا۔ملازمت میں، کاروبار میں، سیاست میں، معیشت میں، دکھاوے میں، پہناوے میں الغرض ہر جگہ مرد و عورت کا اختلاط اس قدر بڑھ چکا ہے کہ مرد و عورت میں فرق کرنا دُشوار ہو گیا ہے۔اسلام نے عورت کو آزادی دی ہے لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ عورت گھر کی چار دیواری سے باہر نکل کر مردوں کے رُوبرو آ کھڑی ہو اور اپنے قد کا موازنہ مرد کے قد سے کرنا شروع کر دے۔عورت کو مذہب اسلام نے ایک مصباح قرار دیا ہے جو گھر کی چار دیواری میں محفوظ رہ کر اپنی لو سے اندھیرے کو مات دے کر اپنی روشنی کا جلوہ بکھیر سکتا ہے لیکن یہ شمع جب شمس وقمر کے مدمقابل آ جائے تو پھر اس کی روشنی کا اپنا پن تاریکی کے اندھیرے میں فنا ہو جائے گا۔دوستو! سیدھی سی بات ہے اللہ نے

نان ونفقہ کا ذمہ دار مرد کو بنایا ہے اور عورت کو گھر کی حفاظت اور مرد کی جائیداد کا نگہبان مقرر کیا ہے۔ آج مرد گھر کی چار دیواری میں محصور ہیں اور عورتیں آوارہ بانکوں کی طرح سرِ عام بازاروں میں گھومتی پھرتی نظر آتی ہیں، گویا ہمارے ملک کا تہذیبی وروایتی نظام ہی تہپلٹ ہو کر رہ گیا ہے۔ کل تلک مرد اپنے گھر کے فیصلوں میں خودمختار تھا اور آج عورت اس مسند پر بیٹھی حکم سازی کرتی نظر آتی ہے۔ ہم نے خود اپنے وجود کو اپنے ہاتھوں سے کاٹ ڈالا ہے اور اب پچھتاوے کا احساس بھی ایک بجھی ہوئی شمع کی مانند بھڑکنے سے پہلے ہی بجھ جاتا ہے۔ اگر دیگر ممالک کی تہذیب اور ثقافت اسی طرح ہمارے ملک کی اخلاقی اقدار اور روایات کے ڈھانچے میں دخیل ہونے کی کوشش کرتی رہیں تو بیس سال بعد ہم اپنی شناخت مکمل طور پر کھو دیں گے۔ دوستو! اگر ہم اس تبدیلی کا آغاز اپنے گھر سے شروع کریں تو وہ وقت دور نہیں جب ہم پھر اُسی نظام حیات کے پیروکار ہو جائیں جس نے صدیوں تلک ہماری ترقی اور خوشحالی کے تصور اور سوچ کو ہرا بھرا اور سرسبز رکھا۔ دوستو! کوشش کریں۔ تھوڑی ہمت کریں۔ تھوڑا صبر اور جبر سے کام لیں۔ ہمارے مشرقی خاندان کا ڈھانچہ ابھی بھی پوری طرح بکھرا نہیں، بس ہوا میں جھول رہا ہے۔ آؤ! اس کی دوبارہ سے تعمیر کرتے ہیں جو چیزیں جس جگہ سے اکھڑی ہیں انھیں وہاں گاڑ دیتے ہیں۔ جو تصورات ہم سے خفا ہو کر رخصت ہو گئے ہیں انھیں منا کر واپس لاتے ہیں۔ جو تہذیب ہماری

شناخت کا حوالہ ہے اسے پھر سے اپنے برہنہ جسموں پر اُوڑھ لیتے ہیں۔ جو اخلاقی اقدار ہم نے مغربی تقلید پرستی میں سٹور روم میں کہیں پھینک دی تھیں انھیں پھر جھاڑ پونجھ کر اپنے گھر کے آنگن میں جگہ دیتے ہیں۔ تھوڑا وقت لگے گا، لیکن کامیابی ضرور حاصل ہوگی۔ اگر آپ ایک قدم بڑھائیں گے تو یہ رُوٹھی ہوئی چیزیں بھاگ کر آپ کی طرف آئیں گی۔ کوشش کریں۔ کوشش کرنے سے اگر حالات بدل جاتے ہیں تو ہم بھی بدل سکتے ہیں۔ اگر ہم نے خود کو بدل لیا تو پاکستان بدل جائے گا۔

کچھ لوگ اُولاد کو محض اس لیے تعلیم دلواتے ہیں تا کہ یہ کسی بڑے ادارے میں ملازم ہو جائیں اور پھر اتنا روپیہ کمائیں جس سے ہماری وہ سب خواہشات اور آرزوئیں پوری ہو جائیں جو ہم سے عمر بھر پوری نہ ہو سکیں۔ اگر اُولاد محض اس مقصد کے لیے پیدا کی جاتی ہے تو پھر یتیم خانے سے لاوارث بچوں کی پرورش کر کے ان سے وہ کام لیا جا سکتا ہے جو اپنے اُولاد سے لیا جاتا ہے۔ لوگوں کی اس منافقانہ سوچ نے ہمارے ملک کی بنیاد کو کھوکھلا کر دیا ہے۔ آخر ہم اب تک یہ کیوں نہیں سمجھ سکے کہ ایک غریب کا بچہ بھی غریب ہی رہتا ہے اوہ زیادہ سے زیادہ خود کو جہدِ مسلسل سے ایک باوقار مقام پر کھڑا تو کر سکتا ہے لیکن برسوں کے دِگرگوں حالات کو اپنی کمائی سے امیرانہ ٹھاٹ بھاٹ میں نہیں بدل سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ایسی سوچ کے حامل والدین کو ان کی اُولادیں بڑی ہو کر تنہا چھوڑ جاتی ہیں۔ وہ بھی کچھ زیادہ کامیاب نہیں ہو پاتیں، بس اپنی جگہ رہ کر خود کو تکلیف دیتے رہتے ہیں اور ناکامیِ قسمت کا رونا روتے رہتے ہیں ۔اُولاد کو اپنے والدین سے گلہ ہے کہ ہمارے والدین نے اپنی خواہشات کے حصول میں ہماری خواہشات اور جذبات کو نظر انداز کر دیا ہے۔ والدین کو یہ رنج عمر بھر رہتا ہے کہ ہماری اُولاد تابع فرمان اور سعادت مند نہیں ہے۔ اس سے تو بہتر تھا کہ ہم بے اُولاد ہی رہتے۔ ہم آخر کیوں نہیں سمجھتے کہ اُولاد کو پیدا کرنے میں ہماری اُولاد کی کوئی

خواہش یا مرضی شامل نہیں تھی۔ وہ آسمان سے ہمیں آواز دے کر زمین پر لانے کو ہمیں مجبور نہیں کرتی تھی بلکہ ہم خود اپنی خواہش کے مطابق اُولاد پیدا کرتے ہیں اور انھیں اپنے مفادات کے حصول کا ذریعہ سمجھتے ہیں لیکن جب ہمارے خود ساختہ معیار کے مطابق اُولاد سانچے میں نہیں ڈھلتی تو ہم انھیں کوسنا شروع کر دیتے ہیں۔ اُولاد اللہ کی دین ہے۔ اس کی رحمت ہے۔ یہ کوئی کاروبار نہیں ہے جس پر خرچ کرنے کے بعد ان سے منافع کا خیال تو رہے لیکن نقصان کے لیے ہم کسی صورت تیار نہ ہوں۔ اُولاد کو اپنی سوچ اور اپنے خیالات کے مطابق ڈھالنے کی کوشش ضرور کریں لیکن ان کی سوچ اور خیالات کو ہرگز نظر انداز مت کریں۔ والدین اور اُولاد کی عمر میں ایک خلا ہوتا ہے جو بیس سے تیس برس تک محیط ہوتا ہے۔ ان تیس برسوں میں تہذیب، اقدار اور رسم و رواج میں تبدیلی ناگزیز ہے ۔اس تبدیلی کا اثر بچوں کی سوچ اور خیالات پر براہ راست ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم انھیں اپنے ڈھانچے میں ڈھالنا چاہتے ہیں اور وہ خود کو اپنی سوچ اور نظریات کے مطابق ترتیب دینا چاہتے ہیں۔ اختلاف کی صورت میں اُولاد مجبور ہو کر والدین سے علاحدگی اختیار کر کے زندگی بھر مسائل و مشکلات کا شکار رہتی ہے۔ کوئی بھی خوش نہیں ہوتا۔ دونوں ایک دوسرے کو جھوٹا اور خود کو سچا سمجھتے رہتے ہیں۔ وقت اسی طرح گزرتا ہے اور جذبات کی برف پگھلنے میں برسوں بیت جاتے ہیں۔ ایک کامیاب خاندان کی ترقی کا راز یہی ہے کہ جب اُولاد جوان ہو جائے تو والدین

اپنی ولدیت کا لباس اُتار کر دوستی کا پیرہن زیب تن کر لے پھر اُولاد کی سوچ اور خیالات میں باہمی ہم آہنگی سے ایک ایسا ماحول پیدا کریں جس سے باہمی گلہ کی صورت نہ رہے اور یوں زندگی کا یہ مختصر وقت ہنستے مسکراتے گزر جائے۔ دوستو! یہ مشکل نہیں ہے۔ تھوڑا وقت لگتا ہے۔ کوشش کر کے دیکھیں۔ زندگی بہت آسان ہو جائے گی۔

میں اکثر لوگوں سے سُنتا ہوں کہ ہمیں قبرستان سے ڈر لگتا ہے۔ عجیب بات ہے، جو لوگ مر گئے ہیں ان کے بے جان جسم منوں مٹی تلے موت کی گہری نیند سو رہے ہیں۔ یہ ہمیں بھلا کیا نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ یہ ہم سے کیا چھین سکتے ہیں۔ یہ ہمیں قید نہیں کر سکتے۔ یہ ہمیں دُکھ نہیں دے سکتے۔ یہ ہمیں شرمندہ نہیں کر سکتے۔ یہ ہم پر تنقید نہیں کر سکتے۔ یہ ہمارے عیب ظاہر نہیں کر سکتے۔ یہ ہمیں تنہا نہیں کر سکتے۔ یہ ہمیں دُھوکا نہیں دے سکتے۔ یہ ہم پر ظلم نہیں کر سکتے۔ اگر یہ ہمارے لیے کسی خطرے کا باعث نہیں ہیں تو پھر ان سے کیا ڈرنا اور کیوں ڈرنا؟ مجھے تو زندہ لوگوں سے ڈر لگتا ہے۔ مجھے ان زندہ لوگوں کی متحرک لاشوں سے خوف آتا ہے۔ ڈرنا ہے تو ان زندہ لوگوں سے ڈرو، جو آپ کے آس پاس ہیں جو آپ کو دُکھ دیتے ہیں، دھوکا دیتے ہیں جو آپ کی جائیداد چھین لیتے ہیں ، جو آپ پر ظلم کرتے ہیں۔ آپ کی زندگی حرام کر دیتے ہیں۔ مردوں سے بھلا کیا ڈرنا؟ قبروں سے بھلا کیا ڈرنا؟ ان مردوں کے پاس جایا کرو۔ ان کے پاس بہت وقت ہوتا ہے۔ ان سے وہ سب باتیں کیا کرو جو زندہ لوگوں سے ممکن نہیں۔ یہ بڑے راز دار ہوتے ہیں۔ خاموش رہتے ہیں کسی کو بتاتے نہیں ہیں کہ آپ ان سے کیا گلے شکوے کرتے ہیں۔ ان مردہ جسموں میں بہت وفا ہے۔ میں ان مردوں کے پاس جب بھی گاؤں جاتا ہوں تو باقاعدگی سے انھیں ملنے جاتا ہوں۔ ان سے

باتیں کرتا ہوں۔ انھیں وہ سب باتیں، لطیفے اور کہانیاں سناتا ہوں جو میرے ذہن محوِ رقص ہوتی ہیں۔ یہ مجھے بڑی محبت سے سنتے رہتے ہیں۔ انھیں کسی بات کی جلدی نہیں ہوتی۔ انھیں کہیں جانا نہیں ہوتا۔ یہ میرے آنے کے منتظر ہوتے ہیں۔ یہ سو قدموں کی دوری سے میرے قدموں کی چاپ سُن لیتے ہیں۔ یہ مجھے برابر دیکھتے ہیں اور باتیں بھی کرتے ہیں لیکن ان کی باتیں ہر کسی کے کان نہیں سُن سکتے۔ ان کی باتیں دل کے کانوں سے سُنی جاتی ہیں اور محسوس کی جاتی ہیں۔ آپ بھی ان سے مل کر دیکھیں، بہت سکون ملے گا۔ یہی تو وہ اصل دوست، ہمارے اپنے دوست ہیں جن کے پاس ہمیں لوٹ کر جانا ہے۔ یہ ہمارے آنے کا انتظار کرتے ہیں۔ جب ان کا دل کرتا ہے یہ بھی ہمارے گھر آتے ہیں لیکن ہم اپنی مصروفیت میں کبھی ان کی طرف توجہ نہیں دیتے، پھر یہ اُداس ہو کر چلے جاتے ہیں اور کبھی لوٹ کر نہیں آتے۔ جب آپ ان کے گھر نہیں جاتے تو وہ آپ کے گھر کیوں آئیں گے؟ ان کے دل بھی ہوتے ہیں۔ ان کی آنکھیں بھی ہوتی ہیں۔ یہ بھی محسوس کرتے ہیں۔ اگر آپ روزانہ ان کے پاس جائیں گے تو یہ بھی روزانہ آپ کے پاس آئیں گے۔ ہم اپنے گھروں کی حفاظت اور صفائی کے لیے لاکھوں کڑوروں خرچ کر ڈالتے ہیں لیکن ان کے گھروں پر اُگی جاڑیوں اور گھاس کو صاف نہیں کرتے۔ دوستی کا مطلب یہ تھوڑا ہوتا ہے کہ دوست کے گھر کو ویران رکھا جائے اور اپنے گھر کو تاج محل کی طرح مزین کیا

جائے۔ مجھے تو بہت برا لگتا ہے کہ میرا کوئی دوست قبرستان میں رہتا ہے اور میں اسے وقت نکال کر ملنے نہ جاؤں۔ اس کے گھر کو صاف ستھرا نہ رکھوں۔ اس کے گھر پر پھولوں کی بارش نہ کروں۔ اس کے سرہانے بیٹھ کر گھنٹوں باتیں نہ کروں۔ مجھے تو اس سے ملے بغیر چین ہی نہیں پڑتا۔ میں ان سے نہ ملوں۔ کیوں جی! کیا میں اپنے بزرگوں سے نہ ملوں؟ کیا میں انھیں نہ ملوں جنھوں نے مجھے گود میں کھلایا اور پیاری سی کہانیاں سنا کر میرے دل کو بہلایا۔ میری میرے نانا، دادا، دادی میرے پڑوسی، میرے گاؤں والے، میرے دوست، میرے کلاس فیلوز، یہ سب میری دُنیا ہیں۔ یہ سب میرے ہونے کا حوالہ ہیں۔ کیا میں آپ چند لوگوں اور اس دُنیا کی جھوٹی باتوں میں آ کر اپنے ان سچے اور کھرے لوگوں سے نہ ملوں اور میں بھی لوگوں کی طرح کہوں کہ مجھے قبرستان سے ڈر لگتا ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ میں اتنا خود غرض نہیں ہو سکتا۔ میں اتنا غافل نہیں ہو سکتا۔ میں اتنا پتھر دل نہیں ہو سکتا۔ آپ ہو سکتے ہیں!!!!!!

☆......میں ہر دن محض اس لیے ضائع کرتا ہوں کہ آنے والا دن اس سے بہتر ہوگا۔
☆......زندگی ایک بھکاری کی طرح ہے جسے کسی دروازے سے خیرات، کسی سے دلاسا، کسی سے پھٹکار اور کسی سے محض بہلاوا ملتا ہے
☆......ہم لوگوں کو سمجھنے کے لیے ایک عمر گزار دیتے ہیں لیکن خود کو سمجھنے کے لیے ایک پل سوچنا بھی گوارا نہیں کرتے۔
☆......اللہ نے ہمارے لیے صحیح اور غلط کا جو نظام بنا رکھا ہے، وہ درحقیقت ہماری زندگی سے عبارت ہے اس سے ماورا کچھ بھی نہیں۔
☆......سائنس جتنی بھی ترقی کر لے وہ خدا کے متعین کردہ اُصولوں میں استخراج واندراج اور اخراج کبھی نہیں کرسکتی۔
☆......کسی شخص کے مستقبل کا انحصار اس کے گھریلو حالات، عمدہ گھر، دولت اور زمین سے نہیں ہوتا۔ اس کے اپنے کردار، رویئے اور تعمیری صلاحیتوں پر ہوتا ہے۔
☆......کامیابی کے لیے مستقل مزاج ہونا ضروری ہے اور ناکامی کے لیے بدمزاج ہونا ضروری ہے۔
دُعا پبلی کیشنز
الحمد مارکیٹ • اُردو بازار • لاہور
Ph: 042-37233585 Mob: 0300-9476417
E-mail: duapublications@yahoo.com
DUA PUBLICATIONS
Design & Print
NAQSH SERVICES
0313 4671988